



فَاتَّعُونِي يَحِبُّكُمْ اللَّهُ
تم میرے فرماؤں پر عمل کرو، میں تمہیں اللہ کی رحمت سے لے کر دوں گا

مولانا احمد رضا قادری

(اور ان کے معاصر علماء اہل سنت)

کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی

<http://t.me/Tehqiqat>

ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا، پاکستان
(رجسٹرڈ)
کراچی، اسلام آباد

<http://t.me/Tehqiqat>

مولانا احمد رضا خاں

(اور ان کے معاصر علماء اہلسنت)

کی

علمی و ادبی خدمات



ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی

(ریسرچ اسکالرشپ ہندو یونیورسٹی بھارت)



ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان

کراچی _____ اسلام آباد

جملہ حقوق عکس و طباعت بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام _____ مولانا احمد رضا (اور ان کے معاصر علماء اہلسنت)

کی علمی و ادبی خدمات

تحریر _____ ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی

ابتدائیہ _____ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

سن اشاعت _____ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۹۹ء

صفحات _____ ۱۹۲

تعداد _____ ایک ہزار

نگران اشاعت _____ اقبال احمد اختر القادری

ناشر _____ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان

ہدیہ _____ ۵۰ روپیہ

تقسیم کار



المختار پبلی کیشنز، کراچی

- ۱۔ ۲۵۔ جاپان مینشن رضا چوک (ریگل) صدر کراچی۔ ۷۴۴۰۰۔
فون : ۱۵۰۔۷۷۲۔۷۷۱۔۰۲۱
- ۲۔ ۴۴ / ۴۔ ڈی، گلی نمبر ۳۸، سیکٹر ایف ۱ / ۶، اسلام آباد۔ ۴۴۰۰۰۔
فون : ۵۱۔۸۲۵۵۸۷

فہرس



۴	ابتدائیہ	
۷	مولانا احمد رضا خاں رضا بیلوی	۱۔
۳۸	مولانا حسن رضا خاں حسن بیلوی	۲۔
۴۶	مولانا عبدالسمیع بیدل رام پوری	۳۔
۵۵	مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری	۴۔
۷۷	مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش جالندھری	۵۔
۸۲	مولانا سید محمد محدث سید کچھو چھوی	۶۔
۹۸	مولانا سید محمد نعیم، نعیم مراد آبادی	۷۔
۱۲۵	مولانا محمد امجد علی اعظمی	۸۔
۱۳۲	مولانا سید سلیمان اشرف بہاری	۹۔
۱۵۷	مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں نوری بیلوی	۱۰۔

Printed by AI-MUKHTAR Publication Karachi Ph # 7725150

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

جناب ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی نے ۱۹۹۱ء میں شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی (بھارت) میں بریلوی علماء کی ادبی و علمی خدمات، کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرایا۔ موصوف نے ڈاکٹر رفعت جمال صاحبہ کی نگرانی میں ۱۹۹۳ء میں اپنا مقالہ مکمل کیا اور ۱۹۹۴ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔۔۔۔۔ عنوان میں لفظ ”بریلوی“ سے بظاہر کسی فرقہ کا گمان ہوتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ برصغیر میں عرف عام میں اس جماعت کو ”بریلوی“ کہا جاتا ہے جس کا تعلق سلف صالحین سے ہے اور جس کا مقبول و محبوب نام ”اہل سنت و جماعت“ ہے۔ دور جدید کے اجداد کا تعلق اسی جماعت سے تھا اور اس جماعت کو سوادِ اعظم کہا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے مقالہ کا عنوان بدل دیا اور یہ عنوان رکھا:-

علمائے اہل سنت کی علمی و ادبی خدمات

ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی نے اشاعت کے لئے یہ مقالہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی کو ارسال فرمایا۔۔۔۔۔ پاکستان کے محققین و دانشوروں کو یہ مقالہ دکھایا گیا انہوں نے مزید اضافوں کی سفارش کی اور نظر ثانی کی تجویز پیش کی۔ ایک دو سال گزر گئے مگر ادارے کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس مقالے میں سات ابواب ہیں، تیسرا باب نسبتاً بہتر تھا اس لئے فاضل مقالہ نگار کے اصرار کے پیش نظر ان کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ باب

ادارہ مسعودیہ، کراچی کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے جس کے لئے حاجی معراج الدین صاحب اور حاجی محمد الیاس صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔ انشاء اللہ نظر ثانی کے بعد پورا مقالہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا، کراچی کی طرف سے شائع کر دیا جائے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء و مشائخ کا ادب سے کوئی تعلق نہیں یا ہے تو بہت ہی کم، یہ خیال صحیح نہیں۔ راقم نے ان حضرات کے ہاں ایسے ایسے جواہر پارے دیکھے ہیں کہ اردو کے عناصر خمہ بھی منہ تکتے رہ جاتیں۔۔۔۔۔ ادب کا تعلق دل سے ہے اور اس کی بنیاد صداقت پر ہے کہ حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے۔ ہم نے جھوٹ اور خیال آرائیوں کو ادب سمجھ لیا اور قرآن حکیم جو حسن و صداقت کی جان ہے اس کو ادب کے خانے سے نکال کر مذہب کے خانے میں ڈال دیا اور یہ نہ دیکھا کہ زبان و بیاں اور حسن و جمال کا وہ ایسا بے مثال اور لازوال نمونہ ہے جس کو سن کر عرب زبان دانوں کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں، آج تک کوئی ادیب و شاعر ایسا ایک جملہ نبی پیش نہ کر سکا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے چھوٹے بھائی حسن بریلوی، داغ دہلوی کے شاگرد تھے ایک روز انھوں نے استاد کو اپنے بھائی رضا بریلوی کا شعر سنایا تو وہ پھرہک گئے اور کہنے لگے۔۔۔۔۔

”مولوی ہو کر ایسے اچھے شعر کہتا ہے؟“

تعریف اپنی جگہ پر مگر اس جملے سے ”مولوی“ کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ مولوی وہ اچھے شعر نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔ اتنے بڑے شاعر نے کیسی عجیب بات کہی!۔۔۔۔۔

ہمارے اکثر ادیب و شاعر دین سے بے گانہ ہیں، ان کو یہ بھی پسند نہیں کہ ان

کے حلقے میں کوئی "مولوی" داخل ہو۔ اسی لئے آپ تاریخ ادب اردو کے مرتبین کو دیندار شعراء و ادباء کو نظر انداز کرتا ہوا پائیں گے جن کے دل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت سے معمور ہیں اور جن کو عرف عام میں "بریوی" کہا جاتا ہے، ہماری کلیات و جامعات کے نصاب میں بالعموم ان کا ذکر و فکر تک نہیں۔ دنیائے علم و دانش میں یہ تنگ ظرفی اور بے خبری حیرت ناک ہے!

بہر حال پاکستان میں بھی ان حضرات پر کچھ کام ہوا ہے اور تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں۔۔۔ مگر یہ اعزاز بنارس ہندو یونیورسٹی کو حاصل ہوا کہ اس نے بریوی علماء کی ادبی و علمی خدمات پر تحقیق کی اجازت دی شاید یہ عنوان پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں تحقیق کے لئے منظور نہ ہو سکتا۔۔۔ ہماری جامعات میں بریوی شخصیات پر تحقیق میں محققین کو ناقابل بیان رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں خود کو مسلمان سمجھنے والوں کی یہ تنگ دلی ارباب علم و دانش کے لئے سخت حیرت ناک ہے۔۔۔ ہندوستان کی جامعات میں زیادہ کشادہ دلی معلوم ہوتی ہے وہاں زندہ شخصیات پر بھی تحقیق کی اجازت ہے جب کہ ہمارے ہاں مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے، ایک طرف یہ شکایت کہ مسلمان مردہ پرست ہیں اور دوسری طرف یہ طرز عمل تعجب خیز ہے۔

بہر حال اس وقت آپ کے سامنے بنارس ہندو یونیورسٹی میں منظور ہونے والے مقالہ ڈاکٹریٹ کا تیمر اباب فاضل مقالہ نگار کی اجازت سے کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس سے مستفید ہوں گے اور فاضل مقالہ نگار کو دعاؤں سے نوازیں گے۔

احقر محمد مسعود احمد صاحب

۱۹ جنوری ۱۹۹۷ء

۹ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

کراچی (سندھ)

(۱)

مولانا احمد رضا خان بریلوی

احمد رضا خان نام اور رضا تخلص ہے۔ مولانا احمد رضا خان نسباً پٹھان مسلکاً حنفی شریباً قادری اور مولدا بریلوی تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خان (م ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) اور جد امجد مولانا رضا علی خان (م ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء) بلند پایہ عالم اور صاحب دل تھے، مولانا احمد رضا خان نے اپنے نعتیہ دیوان حدائق بخشش میں ان دونوں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

مولانا احمد رضا خان ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ / ۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے مولانا کا نام محمد رکھا گیا اور تاریخی نام المختار (۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء) لیکن جد امجد مولانا رضا علی خان نے احمد رضا تجویز کیا۔ بعد میں مولانا احمد رضا نے خود اس نام کے ساتھ "عبدالمصطفیٰ" کا اضافہ کیا۔ چنانچہ اپنے نعتیہ دیوان میں ایک جگہ فرماتے ہیں

خوف نہ رکھ رضا ذرا تو تو ہے عبد مصطفیٰ

تیرے لئے امان ہے تیرے لئے امان ہے

مولانا کے اسلاف عہد مغلیہ میں قندھار سے ہندوستان آئے تھے مغل شہنشاہوں کے دربار میں مناصب جلیلہ پر فائز رہے اور جاگیریں حاصل کیں لیکن ان کے دادا مولانا شاہ رضا علی خان کو جو اپنے وقت کے بے مثال عالم اور ولی تھے سرکاری عہدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ یہی حال ان کے والد ماجد کا بھی رہا۔

مولانا احمد رضا خاں نے میزان و منشعب مولانا مرزا غلام قادر بیگ بریلوی سے پڑھی بعد میں مرزا صاحب نے ان سے ہدایہ کا سبق لیا، مولانا محمود احمد قادری نے لکھا ہے کہ تیرہ برس کی مختصر سی عمر میں ۱۲۸۲ھ میں والد ماجد سے درسیات کی تکمیل کی ۱۲۹۱ھ کے بعد تھوڑے دنوں رام پور میں قیام کر کے مولانا عبدالعلی ریاضی داں سے شرح چغمنی کے چند سبق پڑھے "۱۔ انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ انہوں نے کتنے دنوں تک تعلیم حاصل کی مگر اصغر حسین خاں کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے رام پور میں ایک سال تک تعلیم پائی اور باقی تعلیم بریلی میں حاصل کی چنانچہ اصغر حسین خاں لکھتے ہیں:-

"مولانا نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا مزید تعلیم مرزا غلام قادر بیگ، مولانا ابوالحسین نوری مارہروی، مولانا عبدالعلی رام پوری اور والد محترم سے حاصل کی صرف چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے"۔ ۲

لیکن دونوں تحریروں کے برخلاف مشہور دانشور پروفیسر مسعود احمد تحریر فرماتے ہیں:-

"فاضل بریلوی نے اپنی فطری ذکاوت کی بنا پر ۱۳ سال ۱۰ مہینے اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں:- وذاک لمن تصف شعبان ۱۲۸۶ھ الف و ماء تین و ست و ثمانین و انا اذ ذاک ابن ثلاثہ عشر عاما و عشرة اشهر و خمسة ايام و فی هذا التاريخ فرصت علی الصلوة و تو جہت الی الاحکام"۔ (ترجمہ) وسط شعبان ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور اس وقت ۱۳ سال ۱۰ ماہ اور ۵ دن کا ایک نو عمر لڑکا تھا اور

اسی تاریخ کو مجھ پر نماز فرض ہوئی اور شرعی احکام میری طرف متوجہ ہوئے۔ ”۔^۲
 ان بیانات کی روشنی میں مسعود صاحب کا خیال قرین قیاس ہے کیونکہ انہوں
 نے مولانا احمد رضا خان صاحب کی عبارت پیش کی ہے جس میں ۱۳ سال ۱۰ مہینے اور
 ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کرنے کی تاریخ درج ہے۔ مولانا کی عبارت
 پیش کر کے حوالہ کے طور پر ان کی ایک تصنیف الا جازة الرضویہ لمبجل مكة
 البھیہ (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال مولانا احمد رضا خان نے اپنی فطری ذکاوت کی بنا پر ۱۳ سال ۱۰ مہینے
 اور ۵ دن میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی علوم عربیہ سے فراغت کے بعد ہی ان
 کے والد ماجد مولانا نقی علی خاں نے افتاء کی ذمہ داریاں بھی ان کو سپرد کر دیں اور اس
 چھوٹی سی عمر میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا۔ بڑے ہوتے تو ایک ماہ کی قلیل مدت میں
 قرآن مجید حفظ کر ڈالا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے علوم درسیہ کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی بھی
 تحصیل کی اور بعض علوم و فنون میں تو خود ان کی طبع سلیم نے رہنمائی کی ان علوم و
 فنون میں علم قرآن، علم حدیث، اصول حدیث، فقہ (جملہ مذاہب)، فلسفہ، تفسیر،
 حیثیت، حساب، ہندسہ، قرآت، تجوید، تصوف، سلوک، اخلاق، اسماء الرجال، سیر،
 تاریخ، لغت، ادب، ازٹما طسقی، جبر و مقابلہ، حساب ستینی، لوگار ثنات، توقیت،
 مناظر و مرایا، اکر، زیجات، مثلث کروی، مثلث مسطح، ہیآة جدیدہ، مربعات، جفر،
 زائر جبہ وغیرہ آتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے علم فرائض، نثر و نظم ہندی، خط نسخ
 اور خط نستعلیق وغیرہ میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس طرح مولانا احمد رضا خان بریلوی نے
 جن علوم و فنون پر دسترس حاصل کی ان کی تعداد ۵۴ سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ اسی پر
 اکتفا نہیں کہ انہوں نے ان علوم کی تحصیل کی بلکہ ہر ایک علم و فن میں اپنی کوئی نہ

کوئی یادگار چھوڑی مولانا بریلوی خود تحریر فرماتے ہیں:-

”ولی فی کلہا و جلہا تحریرات و تعلیقات من زمن طلبی

الی هذا الحین-“ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء۔

مولانا احمد رضا خان ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں کے

ہمراہ مولانا شاہ آل رسول (م ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء) سے سلسلہ قادریہ میں بیعت

ہوئے سید آل رسول نے انہیں اجازت و خلافت بھی دی۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علم و فضل کو دیکھ کر ان کے مانتے والوں نے مجدماً

۵ حاضرہ سے نوازا۔ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں قاضی عبدالوحید (م

۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) رئیس پٹنہ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس

میں بریلوی علماء کثیر تعداد میں حاضر تھے ان علماء میں مولانا احمد رضا صاحب بھی موجود

تھے۔ جلسہ کی کاروائی ”دربار حق و صداقت“ کے نام سے چھپی اس میں فاضل بریلوی

کا وعظ بھی چھپا۔ اس جلسہ میں مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے فاضل بریلوی کو مشاہیر

علماء کی موجودگی میں ان الفاظ سے یاد کیا:-

جناب عالم اہل سنت مجدماً ۵ حاضرہ مولانا احمد رضا خاں

دوسرے علماء نے اس کی تائید کی اور اس بات پر سب لوگ متفق ہوئے کہ

مولانا احمد رضا خان چودہویں صدی کے مجدد ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں کو ان کے مانتے والوں نے اپنا امام بھی تسلیم کیا ہے جس سے ان

کی عقیدت اور مولانا بریلوی کی عظمت کا احساس ہوتا ہے مولانا کے علم و فضل کا

اعتراف بہت سے حضرات نے کیا ہے چنانچہ مولانا کو اثر نیازی تلمیذ مولانا ابوالعلی

مودودی لکھتے ہیں:-

”وہ (مولانا احمد رضا خان) بیک وقت ایک عظیم ادیب بھی تھے اور خطیب بھی،

مناظر بھی تھے اور متکلم بھی، محدث بھی تھے اور مفسر بھی، فقیہ بھی تھے اور سیاست داں بھی اور جب وہ تخریثِ نعمت کے طور پر کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے (اور اس لفظ "سخن" میں کلام کی سبھی شاخیں شامل ہیں) کہ

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
 جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں ۶

خورشید احمد رقمطراز ہیں:-

"Maulana Ahmed Raza Khan is the founder of Bareilvi School of thought and one of the most important scholars of this era--- He was master in 'Philosophy and mathematics'.

میر خلیل الرحمن (ایڈیٹر انچیف روزانہ جنگ کراچی) اس طرح قلمبند ہیں:-

"Religious scholars, like Imam Ahmed Raza having full command over all faculties of knowledge' (Science and Arts) are hardly born after many centuries, He lead his whole life in following the Sunnah and for the love of Muhammad Mustafa (Sallalloho alahi wasllam). His knowledge, religious and temporal, was unipersonal to his self. People, having thirst for knowledge, seek inspiration and instruction from the acadmic and thought provoking treasure he left.

Millions of people belong to his school of thought through out the world particularly in the ^ Indo-Pak sub continent".

مولانا احمد رضا کی شخصیت اور علمی فضیلت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان پر ہند اور بیرون ہند یونیورسٹیوں میں کئی حیثیتوں سے تحقیقی کام ہوتے اور ہو رہے ہیں اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ان یونیورسٹیوں میں جوہر نہرو لال یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بنارس ہندو یونیورسٹی، کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ)، کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک)، لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ)، لندن یونیورسٹی (لندن)، محمد بن سعود یونیورسٹی، ریاض (سعودی عرب)، الازہر یونیورسٹی (مصر)، کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ (پاکستان) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

تصنیف و تالیف:- مولانا احمد رضا خان نے اپنی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ اسلامیات کو اپنا موضوع بنا کر ملت کی خدمت کی ان کی بیشتر کتابیں عربی اور اردو میں ہیں۔ فارسی میں بھی لکھا اور اس طرح بیک وقت عربی، فارسی اور اردو کی خدمت انجام دی لیکن اردو دنیا میں ان کی تصانیف کو اہم مقام حاصل ہے۔ مولوی رحمن علی نے "تذکرہ علمائے ہند" میں ان کی تصانیف کی تعداد ۵۷۰ تحریر کی ہے اس وقت مولانا موصوف کی عمر ۳۰ برس تھی لیکن عمر کے اضافے کے ساتھ ہی تصانیف کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں خود مولانا نے اپنی تصانیف کی تعداد ۲۰۰ بتائی ہے۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے ۱۹۰۹ء میں مختلف علوم و فنون پر ان کی ۳۵۰ تصانیف کا ذکر کیا ہے اس میں ۱۰۰ عربی، ۲۰۰ فارسی اور ۲۲۳ اردو کی تصانیف ہیں لیکن مولانا بریلوی کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خاں نے ۴۰۰ سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔

یہ اعداد و شمار مختلف اوقات میں مولانا فاضل بریلوی کی زندگی میں مرتب کئے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا ظفر الدین بہاری نے شمار کیا تو یہ تعداد چھ سو سے زیادہ نکلی جس کا تفصیلی ذکر انہوں نے "حیات اعلیٰ حضرت" جلد دوم میں کیا ہے۔ ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء میں بمبئی سے ماہنامہ "المیزان" کا امام احمد رضا نمبر شائع ہوا ہے اس میں مولانا بریلوی کی پچاس علوم و فنون پر ۵۴۸ تصانیف کا ذکر موجود ہے۔ ماہنامہ قاری، دہلی اپریل ۱۹۸۹ء نے بھی یہی تعداد ۵۴۸ شائع کی ہے۔ مفتی اعجاز ولی خاں نے مزید تحقیق کی تو یہ تعداد ہزار سے بڑھ گئی۔ انہوں نے مولانا احمد رضا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

«صاحب التصانیف العالیہ و التالیفات الباہرہ التی بلغت اعداد ہا

فوق الالف»۔^۹

میری تحقیق کے مطابق اعجاز ولی خاں کی تحقیق ہی بجانب ہے۔

قرآن و تفسیر:- مولانا رضا بریلوی کو مختلف علوم و فنون میں بڑی مہارت حاصل تھی جن کی شہادت ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ علم قرآن میں ان کا ترجمہ اردو امتیازی شان کا مالک ہے۔ جو "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا پھر اس پر مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے "خزائن العرفان فی تفسیر القرآن" کے عنوان سے تفسیری حواشی لکھے۔

ترجمہ قرآن میں مولانا احمد رضا خان بریلوی نے جس عاقبت اندیشانہ احتیاط کو پیش نظر رکھا ہے وہ تراجم کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہے۔ مولانا بریلوی کے اس ترجمہ قرآن کے بارے میں استاد سعید بن عزیز یوسف زئی امیر جمعیت برادران اہل حدیث پاکستان: تحریر فرماتے ہیں:-

”جہاں تک علمائے دیوبند کا تعلق ہے وہ تو نہایت شد و مد سے اس کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ تکفیر کرتے ہیں مگر میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ آئم سے لے کر والناس تک ہم نے کنز الایمان میں نہ تو کوئی تحریف پائی ہے اور نہ ہی ترجمہ میں کسی قسم کی غلط بیانی کو پایا ہے۔ نہ ہی کسی بدعت اور شرک کرنے کا جواز پایا ہے بلکہ یہ ایک ایسا ترجمہ قرآن مجید ہے کہ جس میں پہلی بار اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جب ذات باری تعالیٰ کے لئے بیان کی جانے والی آیتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے تو بوقت ترجمہ اس کی جلالت، علوت، تقدس و عظمت و کبریائی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ دیگر تراجم خواہ وہ اہل حدیث سمیت کسی بھی مکتب فکر کے علماء کے ہوں ان میں یہ بات نظر نہیں آتی ہے اسی طرح وہ آیتیں جن کا تعلق محبوب خدا، شفیع روز جزا سید الاولین والآخرین، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یا جن میں آپ سے خطاب کیا ہے تو بوقت ترجمہ جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب نے یہاں پر بھی اوروں کی طرح صرف لفظی اور نحوی ترجمہ سے کام نہیں چلایا ہے بلکہ صاحب ماینطق عن الہوی اور ورفعنا لک ذکرک کے مقام عالی شان کو ہر جگہ ملحوظ خاطر رکھا ہے یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کہ دیگر تراجم میں بالکل ناپید ہے۔“

مولانا احمد رضا کے ترجمہ کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں الفاظ و محاورہ کا حسین امتزاج ہے پھر انہوں نے ترجمہ کے سلسلہ میں بالخصوص یہ التزام بھی کیا ہے کہ ترجمہ لغت کے مطابق ہو اور الفاظ کے متعدد معانی میں سے ایسے معانی کا انتخاب کیا جائے جو آیات کے سیاق و سباق کے اعتبار سے موزوں ہوں اس ترجمہ سے قرآنی حقائق و معارف کے وہ اسرار و معارف منکشف ہوتے ہیں جو عام طور پر دیگر تراجم سے واضح نہیں ہوتے۔ یہ ترجمہ سلیس، شگفتہ اور رواں ہونے کے ساتھ روح

قرآن اور عربیت سے بہت قریب ہے۔ ان کے ترجمہ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ احمد رضا بریلوی نے ہر مقام پر انبیاء علیہم السلام کے ادب و احترام اور عزت و عصمت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے ترجمہ قرآن کے جملہ محاسن تحریر کرتے وقت الفاظ کا خزانہ کم پڑ جائے گا۔ دوسرے تراجم کے مقابلے میں ان کی زبان کی خوبی کا اندازہ ان جملوں سے لگایا جاسکتا ہے:-

آیت نمبر ۱۔ ذالک الكتاب لا ریب فیہ (پارہ ۱) مولانا محمود الحسن صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔" اور مولانا اشرف علی تھانوی اس کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں "یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔" عربی محاورہ کے مطابق یہاں جنس ریب کی نفی ہے اور لفظ فی کا مدخول ظرفی ہوتا ہے کسبھی زمان اور کسبھی مکان تو اب معنی یہ ہو گا کہ قرآن مجید جنس ریب کا محل نہیں بنا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں کسی نے شک نہیں کیا حالانکہ دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے:- "ووان کنتم فی ریب مما نزلنا واور اس سے واضح ہے کہ قرآن محل ریب بنا اور لوگوں نے اس میں ریب کیا ہے۔ یہی وہ اشکال تھے جسے رفع کرنے کے لئے علامہ تفتازانی نے "مطول" اور علامہ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لمبی عبارتیں تحریر فرمائی ہیں لیکن مولانا احمد رضا خان نے ترجمہ کے چند الفاظ میں اشکال رفع کر دیا ہے مولانا بریلوی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:- "وہ بلند مرتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں۔" ذالک جو اشارہ بعید کے لئے آتا ہے (اشارۃ بعید) وہ کا معنی رکھتا ہے یہاں پر "ذالک الكتاب" کا ترجمہ "وہ بلند مرتبہ کتاب" عبارت کا حسن بڑھا دیتا ہے۔ اور کتاب اللہ کی حقانیت اور اس کی عظمت کی طرف میسر ہے۔

آیت نمبر ۲۔ یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم لعلکم تتقون (پارہ ۱۵ رکوع ۳) مولانا محمود الحسن صاحب ترجمہ کرتے ہیں:-

”اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پر ہمیز گار بن جاؤ۔“ مختلف ترجمہ نگاروں کے نزدیک لفظ لعل بمعنی لکی ہے یعنی تاکہ تم پر ہمیز گار بن جاؤ لیکن علامہ بیضاوی نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے ”ولم یثبت فی اللغة مثله“ یعنی لغت میں اس کی مثال ثابت نہیں ”پھر علامہ بیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ حال ہے ضمیر اعبدوا سے۔ مطلب یہ ہوا کہ اعبدوا راجعین ان ینحز طوافی سلک المتقین یعنی عبادت کرو یہ امید کرتے ہوئے کہ تم مستقیوں کی صف میں شامل ہو جاؤ۔ مولانا احمد رضا خاں نے اسی استدلال کو اختیار کیا ہے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے وہ آیت مذکور کا ترجمہ اس طرح تحریر کرتے ہیں ”اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پر ہمیز گاری ملے۔“

ادبی نقطہ نظر سے بھی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ترجمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جتنے تراجم کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں احمد رضا خاں صاحب کا ترجمہ پرانا ہے اس وقت اردو زبان اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جس شکل میں آج ہے مگر ان کی زبان اور طرز تحریر سے ایسا لگتا ہے کہ وہ آج ہی کا طرز تحریر ہے۔ یہی ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب کو قرآن سے غیر معمولی شغف تھا جس کے مطالعہ میں انہوں نے اپنی ساری عمر صرف کر دی اور اعلیٰ معیار کا ترجمہ اردو کو دیا جو ان کی برسوں کی فکر و تدبر کی دین ہے۔

مولانا احمد رضا خاں نے ترجمہ قرآن کے علاوہ تفسیر کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا انہوں نے سورۃ فتح کی بعض آیتوں کی تفسیر ۸۰ جزیہ تک لکھ کر چھوڑ دی۔ دینی و علمی مشاغل کی وجہ سے مزید قرآن کی مبسوط تفسیر نہ لکھ سکے اس کام کو ان کے

تلامذہ نے انجام دیا مثلاً تفسیر خراتن العرفان، تفسیر حسنات، تفسیر نعیمی، تفسیر ضیاء القرآن، تفسیر ازہری، تفسیر تنویر القرآن وغیرہ ان کے تلامذہ اور خلفاء نے لکھیں۔ حال کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے سورۃ فاتحہ سے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی چنانچہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی شروع آیات کی تفسیر کچھ (مخطوطہ) اوراق دریافت ہوئے ہیں جس کو شائع کیا گیا ہے اس کے مرتب میں مولانا مفتی - (ادارہ)

حدیث :- علم قرآن و علم تفسیر کے علاوہ علم حدیث میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو تبحر حاصل تھا چنانچہ شیخ یسین احمد خیاری المدنی نے علم حدیث میں مولانا بریلوی کے تبحر کو یوں سراہا ہے ”وہو امام المحدثین“ یعنی اور وہ محدثین کے امام ہیں۔ ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے علم حدیث میں ان کی مہارت اور غیر معمولی آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فن میں انہوں نے چند یادگار تصانیف بھی چھوڑی ہیں فقہ و فتویٰ :- علم حدیث کے علاوہ علم فقہ میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ان کی باریک بینی اور نظر غائر کی دلیل ہے جس کی مثال ”فتاویٰ رضویہ“ کی ۱۳ تہیم جلدیں ہیں اس کی جلد اول میں انہوں نے اس پانی کی خصوصیات بیان کی ہیں جس سے وضو جائز ہے مولانا بریلوی نے اس پانی کی ایک سو ساٹھ قسمیں بیان کی ہیں اور وہ جس سے وضو ناجائز ہے اس کی ایک سو چالیس قسمیں بیان کیں اسی طرح پانی کے استعمال سے عجز کی ۱۷۵ صورتیں بیان کیں ہیں اور اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جس کا عنوان ”سمح المذاء فیما یورث العجز عن الماء“ ہے۔ ”ماہ مطلق اور ماہ مقید کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان یہ ہے ”النور والنورق لاسفار الماء المطلق“ وہ چیزیں جن سے تیمم جائز ہے ان کی ۱۸۱ قسمیں بیان کیں ۷۴ منصوصات اور ۱۰۷ مزیدات مصنف اور وہ چیزیں جن سے تیمم جائز

نہیں ان کی ۱۳۰ قسمیں بیان کیں ۵۸ منصوصات اور ۷۲ زیادات۔ ان کا مجموعہ فتاویٰ رضویہ بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی خوبیوں کا اعتراف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

”فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر ان کو جو عبور حاصل ہے اس کی نظیر شاید کہیں ملے اور اس دعویٰ پر ان کا مجموعہ فتاویٰ شاہد ہے۔“ ۱۲

فتاویٰ رضویہ کے مطالعہ سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کتنا وسیع علم ہے اور ایک باکمال فقیہ ہونے کے لئے کس قدر علوم و فنون سے واقفیت ضروری ہے۔ مولانا بریلوی کے بعض فتاویٰ مختلف علوم و فنون پر مستقل رسائل معلوم ہوتے ہیں مثلاً حوض کی مقدار ”دہ در دہ اور ذراع سے متعلق بحث پر ان کا یہ فتویٰ ”الھینتی النمیر فی الماء المستدیر“ ریاضیات سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دارالافتاء (بریلی) میں ہندو پاک، برما، چین، امریکہ، روس، افغانستان، افریقہ، اور اسلامی ملکوں وغیرہ سے بہت زیادہ فتاویٰ آتے تھے جن کی تعداد ایک وقت میں کبھی چار سو اور کبھی پانچ سو تک جا پہنچتی تھی۔ مولانا احمد رضا کے یہ فتاویٰ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، مطبوعہ ”فتاویٰ رضویہ“ میں تینوں زبانوں (عربی، اردو، فارسی) میں فتاویٰ موجود ہیں، انگریزی فتوے ان کے قلمی مجلدات میں ہیں جو بریلی میں محفوظ ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنا پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی منایا اس سلسلہ میں عباسیہ ہال میں تعلیمی نمائش کا اہتمام کیا گیا جہاں بڑے بڑے طغروں میں ہندوستان کی ممتاز علمی شخصیتوں کے نام اور بعض تصانیف فن وار درج تھیں عقائد

و کلام کے طغری میں مولانا احمد رضا خاں صاحب کی بھی کتابیں موجود تھیں اس موقع پر ایک مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ (پروفیسر کلیتہ الشریعہ) محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض) بھی حاضر تھے انہوں نے مولانا بریلوی کا مجموعہ فتاویٰ طلب کیا تھا۔ اس سے مولانا کے اس مجموعہ کی اہمیت اور شہرت کا پتا چلتا ہے۔ مشہور شاعر اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال "فتاویٰ رضویہ" کے بارے اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"ہندوستان کے دور آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے اور ان کے فتاویٰ سے ان کی ذہانت، فطانت، جودت طبع، کمال فقہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عدل ہیں مولانا ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے ہیں اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یقیناً اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے ہیں لہذا انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی"۔ ۱۳

ریاضی:- علوم منقولہ کے علاوہ علوم معقولہ میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو کمال حاصل تھا۔ ایک عالم دین کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس کا دائرہ فکر دوسرے علوم و فنون کو بھی اپنی گرفت میں اتنا ہی رکھتا ہے جتنا علم دین کو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے پہلے ڈاکٹر سر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے علم مربعات سے متعلق ایک سوال اخبار دبدبہ سکندری (رام پور) میں شائع کرایا جس کا مولانا احمد رضا صاحب نے وقت پر جواب شائع کرادیا اور اپنی طرف سے ایک اور سوال پیش کر دیا جس کو پڑھ کر سر ضیاء الدین صاحب کو تعجب ہوا کہ ایک

مولوی نے نہ صرف جواب دیا بلکہ الٹا سوال بھی پیش کر دیا۔ مولانا بریلوی سے سر ضیا الدین کا یہ پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس کے بعد وہ پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری کے کہنے پر ریاضی سے متعلق ایک حل نہ ہونے والا مسئلہ دریافت کرنے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پاس گئے جس کو انہوں نے بخوبی حل کر دیا اس سے ریاضی میں مولانا کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

فلسفہ ہیماۃ و نجوم و سائنس۔ علم ریاضی کے علاوہ علم ہیماۃ و نجوم میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو کمال حاصل تھا۔ انگریزی اخبار ایکسپریس شمارہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں امریکی منجم پروفیسر البرٹ نے ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کے بارے میں ایک دل دہلانے والی پیش گوئی کی تھی۔ امریکی نجوم کی پیش گوئی کو رد کرتے ہوئے انہوں نے تین رسالے لکھے جو یہ ہیں (۱) الكلمة الملممة فی الحکمة المحکمتہ لوہاء الفلسفتہ المشتمة (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) (۲) فوز مبین در رد حرکت زمین (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) (۳) نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء)

صوتیات اور علم التوقیت میں بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو مہارت حاصل تھی اس فن سے متعلق مولانا کے یہ رسائل قابل ذکر ہیں (۱) البیان شافیا لقونو غرافیا (۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) (۲) الجواہر والیواقیت فی علم التوقیت۔

علم تکسیر میں ایک رسالہ سید حسین مدنی کے لئے لکھا جس کا عنوان "اطائب الاکسیر فی علم التکسیر" ہے اور مولانا عبدالغفار بخاری کے لئے علم جفر میں رسالہ "سفر السفر عن الجفر بالجفر" لکھا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی نہ صرف مذہبیات اور مختلف علوم و فنون تک محدود رہے بلکہ سماجی اور سیاسی شعور بھی رکھتے تھے انہوں نے معاشرے کی اصلاح کے

ساتھ سیاسی پہلو پر بھی غور و فکر کیا اس سلسلے میں مولانا کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں
 (۱) نفس الفکر فی قربان البقر (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) (۲) اعلام الاعلام بان
 ہندوستان دارالسلام (۱۳۰۶ھ - ۱۸۸۸ء) (۳) تدبیر فلاح و نجات و اصلاح
 (۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء) (۴) دوام العیش فی الائمۃ من القریش (۱۳۳۹ھ /
 ۱۹۲۰ء) (۵) المحجۃ المؤمنۃ فی آیتہ الممتحنہ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) (۶) الطاری
 الداری لہفوات عبدالباری (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء)

پہلے رسالہ میں گاتے کی قربانی کے جواز و عدم جواز کے متعلق ایک استفتاء کا
 جواب ہے۔ رسالہ اعلام الاعلام میں دوسرے علماء سے اختلاف کرتے ہوئے
 ۱۸۸۸ء میں مولانا احمد رضا صاحب نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا اور سود کو
 حرام۔ دوام العیش میں مولانا نے مسئلہ خلافت پر بحث کی ہے۔

۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بعض ایسے
 اقوال و اعمال سرزد ہوئے جو مولانا احمد رضا خان کی نظر میں خلاف شرع تھے اور سیاسی
 حیثیت سے مسلمانوں کے لئے تباہ کن، چنانچہ انہوں نے اس طرز عمل پر سخت تنقید
 کی۔ مولانا کی یہ تنقیدات الطاری الداری لہفوات عبدالباری (۱۳۳۹ھ /
 ۱۹۲۰ء) کے نام سے ان کے صاحبزادے مولانا محمد مصطفیٰ رضا خان نے تین حصوں
 میں بریلی سے شائع کر دیں۔

مولانا احمد رضا خان سیاسی استحکام کے لئے معاشی استحکام کو ضروری سمجھتے تھے دور
 بید کے عالمی حالات سے ان کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ ملت اسلامیہ کی
 معاشی و اقتصادی اور مذہبی و اخلاقی فلاح و بہبود کے لئے انہوں نے چند اہم تجاویز
 پیش کیں جو ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء میں کلکتہ اور رام پور سے شائع ہوئیں۔

مولانا احمد رضا نے ایک طرف اپنا رسالہ "تدبیر فلاح و نجات و اصلاح" لکھ کر

اپنی تجویزیں عام کیں تو دوسری طرف انصار الاسلام اور جماعتِ رضائے مصطفیٰ کے نام سے ان کے متبعین نے اصلاحی تنظیمیں قائم کیں۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات شروع ہوئی جو تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کا تتمہ کہی جاسکتی ہے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا جو ایک طوفان اٹھا تھا وہ اب شباب پر پہنچ گیا۔ مسلمان عوام و خواص اپنی سادگی اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس کے مضر اثرات کو محسوس نہ کرتے تھے مگر مولانا احمد رضا خان صاحب نے یہ بات شدت سے محسوس کی اور مسلمانوں کو ایسے اتحاد سے باز رہنے کے لئے کہا جو ان کی سیاست و معیشت اور مذہب سب کو ختم کر کے رکھ دے۔ چنانچہ انہوں نے شدید علالت کے باوجود رسالہ المحجۃ المؤتمنتہ فی آیتہ الممتحنہ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) لکھا جس میں مسلمانوں کو اس اتحاد سے متنبہ کیا اور مخالفین کے عزائم سے خبردار۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے پہلا سفر حج اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں کے ساتھ ۲۳ سال کی عمر میں ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں کیا۔ اسی سفر میں مناسک حج سے متعلق شیخ حسین بن صالح کے ایک وقیع رسالہ کی نہایت جامع و مانع شرح صرف دو دن کی مختصر مدت میں کی اور اس کا نام ”النیرۃ الوضیۃ فی شرح الجوہرۃ المضمینۃ“ رکھا اس شرح کو علمائے حجاز نے بڑی مقبولیت کی نظر سے دیکھا۔ اس شرح میں پہلے مطلب پھر اختلاف مذاہب حنفیہ و شافعیہ اور مذہب حنفی میں اختیار رائج و ترک مرجوح کو مدلل و مبرہن کیا۔ پھر بعد میں اس رسالہ میں فوائد لطیفہ و توضیح مسائل و تخریج احادیث وغیرہ کے تعلیقات و حواشی لکھے جو ایک مستقل رسالے کی صورت میں ”السطرۃ الرضیۃ علی النیرۃ الوضیۃ“ کے نام سے شائع ہوا۔

اسی سفر میں علمائے ندوہ کے خلاف مشاہیر علمائے ملت اسلامیہ ہند کے حاصل شدہ فتاویٰ کا مجموعہ ”الجام السنۃ لاجل الفتنۃ“ کے ساتھ ۲۸ پیدا ہونے والے

سوالات اور ان پر اپنی جانب سے مدلل جوابات پر مشتمل ایک فتویٰ جب حاجیوں کے ذریعہ شیخ سید اسماعیل مکی بن شیخ خلیل محافظ کتب خانہ حرم شریف و تلمیذ رشید شیخ عبدالحق مہاجر مکی صاحب و دیگر علمائے مکہ کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام علماء نے اپنی تصدیقات و تقریحات سے اس فتویٰ کا خیر مقدم کیا اور ان حاصل شدہ توثیقات کا مجموعہ بنام "فتویٰ الحرمین برجف ندوة العلماء" ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔

مولانا احمد رضا خان صاحب نے دوسرا سفر حج ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں کیا حسام الحرمین (۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء)، الدولتہ المکیہ (۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۶ء) کفل الفقیہ الفاحم (۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء) وغیرہ اس سفر کی تصانیف ہیں۔ الدولتہ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں علم غیب کا اثبات اور مخالفین علم غیب کی تردید کے ساتھ پوری وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ چار سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے مولانا سلامت اللہ رام پوری کی کتاب "اعلام الاذکیا" کے آخر میں ایک عبارت سے متعلق تین سوالات اور ایک سوال خطبہ مدارج النبوت للشیخ عبدالحق دہلوی سے متعلق ہے۔ مولانا کی مذکورہ بالا تصانیف اردو زبان میں ہیں۔

شعر و ادب:- مولانا احمد رضا خان نہ صرف ایک عالم دین اور مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے بلکہ اپنے عہد کے ایک ممتاز و معروف شاعر بھی تھے ان کا تخلص رضا تھا وہ ایک باکمال و فطری شاعر تھے پروفیسر مسعود احمد کے بقول:-

"مولانا بریلوی باکمال شاعر تھے، وہ تلمیذ رحمن تھے، شاعری میں

ان کا کوئی استاد نہ تھا"۔^{۱۴}

اضافہ شعر میں صنف نعت سے زیادہ مقدس، نازک اور دشوار گزار کوئی دوسری صنف نہیں اسی لئے فارسی شاعر عرفی کہتے ہیں "نعت لکھنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نعت میں ذرا بھی چوک ایمان کو خارج کر دیتی ہے رضا

بریلوی کے مطالعہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ اس مشکل اور نازک مرحلے سے گزرتے نظر آتے ہیں اور ذرا بھی کہیں لغزش نہیں ہوتی۔ رضا بریلوی کی نعت گوئی اپنے معیار کے اعتبار سے ایک انفرادی و امتیازی شان کی مالک نظر آتی ہے۔ وہ نعت کہتے وقت قرآن کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ قرآن سیرت مصطفیٰ کا آئینہ ہے اور اس آئینہ کو رو برو رکھنے کے بعد فکر کی رفتار میں کسی لغزش کا امکان ہی نہیں رہتا ہے۔ ان کا یہ مصرع ان کی نعتوں کا معیار پر رکھنے کے لئے بہت کافی ہے۔

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے آداب شریعت ملحوظ

مہکا ہے میرے بونے دہن سے عالم
یاں نغمہ شیریں نہیں تلخی سے بہم

کافی سلطان نعت گو یاں رضوان شاعر اللہ میں وزیر اعظم (حداق بخش باقیات رضا حصہ سوم) مولانا احمد رضا مشہور نعت گو شاعر مولانا کفایت علی کافی شہید سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے احتیاط کے ساتھ نعت گوئی میں کمال حاصل کیا خود کہتے ہیں۔
جو کہے کہ شعر و پاس شرع، دونوں کا حسن کیوں کر آئے

لا سے پیش جلوہ زمزمیہ رضا کہ یوں !!!

یہی کہتی ہے بلبل باغ جنان کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدی مجھے شوخی طبع رضا کی قسم

ابتداء میں رضا بریلوی کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا مثلاً ماہنامہ الرضا (بریلی) ماہنامہ تحفہ حنفیہ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے نعت اور صرف نعت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس صنف کو بہترین ادبی جواہر پاروں سے مزین کیا اور ایسی

ایسی نعتیں لکھیں جو زبان و بیان، فکر و فن، اظہار و ابلاغ اور تاثیر و تاثر کے اعتبار سے اردو ادب میں سرمائے کا درجہ رکھتی ہیں ان کی فارسی نعتیں بھی اس درجہ کمال کی ہی ہوتی ہیں۔ انہوں نے نعت کے میدان میں اپنی جودت طبع کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ مولانا احمد رضا بریلوی کی ایک نعت ایسی بھی ہے جس میں اردو، ہندی اور عربی، فارسی الفاظ ایک ساتھ استعمال کئے ہیں جو نعت گوئی کا ذوق رکھنے والوں کے ذہنوں میں ہمیشہ اپنی جگہ قائم رکھے گی۔ یہ تخلیق ذہنی تنوع اور علمی ظرف کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ہمیں فاضلی، قآنی، خسرو اور انشاء اللہ خاں انشا کے علاوہ شاید ہی کہیں نظر آسکے وہ نعت یہ ہے۔

لم یات نظیرک فی نظر مثل تونہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تو رے سر سو ہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا
البحر علا و الموج طغی من بے کس و طوفاں ہوش ربا
منجدہار میں ہوں بگڑی ہے ہوا موزی نیا پار لگا جانا

لیکن بیک وقت چار زبانوں میں کسی شاعر کی طبع آزمائی کی مثال نہیں لکھی

ہے (ادارۃ)

یا شمس نظرت الی لیلیٰ چو بطیبہ رسی عرفے بکنی
توری جوت کی ^{جھلجھل} جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

لک بدر فی الوجہ الاجمل، خط ہالتہ مہ زلف ابر اجل
تورے چندن چندر پر و کنڈل رحمت کی بحرین برسا جانا

انا فی عطش و سخاک اتم، اے گیوتے پاک اے ابر کرم
برسن ہا رسے رم ججم رم ججم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

یا قافلتنے زیدی اجلک، رحمے بر حسرت تشنہ لبک
مورا جیرا لرجے درک درک طیب سے ابھی نہ سنا جانا

واہا لسویعات ذہبت آں عہد حضور بار گہت
جب یاد آوت موہے کر نہ پرت دردا وہ مدینہ کا جانا

القلب شج و الہم شجون، دل زار چناں جاں زیر چمنوں
پت اپنی پت میں کا سے کہوں مرا کون ہے تیرے سوا جانا

الروح فداک فزد حرقا یک شعلہ دگر برزن عشقا
مورا تن من دهن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

بس خامتہ خام نواتے رضا نہ یہ طرز میری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبا ناطق تھا نا چار اس راہ پڑا جانا

رضا بریلوی کی ایک غزل محاسبہ نفس کے لئے ہے اور ایسی مرصع ہے کہ جدید

اردو شاعری بھی اس پر ناز کرے گی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو ! جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے

آنکھ سے کاجل صاف چرائیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ جھگ ہے ماری رکھے گا
ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کسی متوالی ہے
مولانا احمد رضا خان رضا کا مجموعہ کلام مستحی بہ "حدائق بخشش" دو حصوں پر
مشتمل ہے اس کا مطبع چمن آفسیٹ پرنٹرس سویوالان، دہلی ہے اور سنہ طباعت
۱۱ صفر ۱۴۰۳ھ ہے۔ اس کا حصہ اول ۹۷ صفحات اور حصہ دوم ۸۶ صفحات پر
مشتمل ہے۔

رضا صاحب کے کلام کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری عشق
رسول میں ڈوبی ہوئی اور شاعری کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ شاعر لکھنوی لکھتے
ہیں۔

رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری جذبے کی پختگی کے علاوہ ایسی بے
شمار فنی خوبیوں کی حامل ہے، جن کی مثال اس دور کے شعراء میں
بہت کم ملتی ہے۔" ۱۵

شاعری میں ایک بہت ہی مشکل نوع علم ہیئت و نجوم و فلسفہ کی مصطلحات کا
استعمال ہے جو اردو شاعری میں کم مستعمل ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان علوم کی
اصطلاحات کو استعمال کرنے کے لیے ان علوم کی سمجھ اور ان پر دسترس بہت
ضروری ہے شاعری کی اس نوع پر رضا بریلوی سے قبل ملا بدر الدین نے البتہ علم
ہیئت و نجوم کی اصطلاحات اپنے کلام میں پیش کیں اور اس فن کا اظہار مسلمان بادشاہ
فیروز شاہ تغلق کی شان میں ایک طویل قصیدہ میں کیا لیکن نعت شریف میں ان
مصطلحات کا استعمال کہیں نہیں نظر آتا اس لئے کہ یہ نوع شاعری کا سب سے محنت
طلب امر ہے مگر رضا بریلوی میں خداداد صلاحیت کے مظاہر دیکھتے کہ ان مشکل ترین

مصطلحات میں بھی انہوں نے طویل نعتیہ قصیدہ لکھا جو ۵۵ یا ۸۵ اشعار پر مشتمل ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

علامہ شمس الحسن شمس بریلوی مرحوم منفوزے ۱۲۵ اشعار کی شرح لکھی ہے "جو معارف رضا" کے ۱۹ اور ۱۹ کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ (ادارہ) ۷

خالق افلاک نے طرفہ کہلائے چمن

ایک گل سو سن میں ہیں لاکھوں گل یا سمن

نقطہ پہ خط کھیچے خط سطح کہے خط غلط

تن کہے میں ہوں فقط جاں کہے مٹی ہے تن

سبزہ و گل دل نشین محو تماشائے حسین

بانوے اقلیم حسین دلربا بابل وطن

چشمہ بے آب میں عرض سرِ مو نہیں

دو بنے جاتے کہاں شرم کے مارے کون

سفر حج کے دوران مکہ سے مدینہ روانگی کے وقت رضا صاحب نے ایک نظم

تحریر فرمائی تھی جو واردات و کیفیات قلبیہ کی آئینہ دار ہے اور جس کے حرف حرف

سے عشق محبت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اس نظم کا مطلع یہ ہے۔

جا. حیو ! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھ

کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

رکن شامی سے مٹی وحشت شام غربت

اب مدینہ کو چلو صبح دل آرا دیکھو

رضا بریلوی نے جس کی تعریف کی اسی ایک نسبت سے کی۔ اولیاء کا ملین کی

منصبتیں لکھیں مگر اہل دول کی مدح و ثنا سے اپنے عشق و محبت کو روانہ کیا اس سلسلے

میں وہ دیگر شعراء کی طرح درباری شاعر نہ تھے جو شعراء نوابوں دولت مندوں کی شان میں قصیدے کہہ کر پیسے لیتے چنانچہ وہ کہتے ہیں ۔

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرادین پارہ ۔ ناں نہیں
رضاکے برادر اصغر حسن رضا خان حسن نے اپنے اساد داغ دہلوی کو رضا صاحب کا
یہ شعر ۔

وہ سوتے لالہ زار پھرتے ہیں

تیرے دن اسے بہار پھرتے ہیں

سنایا تو داغ صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا کہ مولوی ہو کر ایسا شعر کہتا ہے۔
مولانا احمد رضا خان نے بلاغت کلام کے علاوہ نئی زمینوں میں اشعار لکھے طبیعت
کی موزونی اور روانی نے کلام کو شعریت و تاثیر بخشی مثلاً ۔

رنگ مژہ سے کر کے نخل یار شاہ میں
کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمال گل

سرتا بقدم ہے تن سلطانِ زمن پھول
لب پھول دہن پھول ذقن پھول بدن پھول

طوئی میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو روح قدس سے ایسی شاخ

پہلے شعر میں مژہ پر ابھرتے ہوئے اشکوں کو عطرِ جمالِ گھل رعنا کہنا اور مژہ کو
کانٹے سے نسبت دینا بڑی نازک بات ہے۔ دوسرے شعر میں قامتِ محبوب خدا کی اس
سے بہتر اور کیا تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔ تشبیہ کی ندرت و پاکیزگی، فکر کی معانی

آفرینی، الفاظ کا انتخاب، اظہار کی معصومیت، سب کے سب وصف ایک مطلع میں جمع ہو گئے ہیں۔ تیسرے شعر میں روح القدس سے طوئی کی سب سے اونچی، نازک اور سیدھی شاخ مانگنے اور اس کا قلم بنا کر نعت نبی لکھنے کی تمنا ان کی نازک خیالی، تنوع اور ندرت فکر کا پتہ دیتی ہے اسی سلسلے کا ایک اور شعر توجہ کا طالب ہے ملاحظہ ہو۔

ظاہر و باطن، اول و آخر، زیب فروع و زین اصول

باغ رسالت میں ہے تو ہی گل، غنچہ، جڑ، پتی، شاخ

یہاں فروع، اصول، اول و آخر اور ظاہر و باطن کہہ کر اس سے پھول، غنچہ، جڑ،

پتی اور شاخ کا ثبوت فراہم کرنا، ابداع و اختراع سخن کا بڑا جامع نمونہ ہے۔ رضا

بریوی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں کتنی سادہ بات کیسے خوبصورت انداز میں کہ

دی ہے۔

قافلے نے سوتے طیبہ کمر آرائی کی

مشکل آسان الہی مری تنہائی کی

قافلے کا دیار حبیب کی طرف چلنے کے لئے کمر کسنا اور ایک عاشق رسول کا ایسے

موقع پر تنہا رہ جانا کیا قیامت کا منظر ہے۔ ساتھ جانا اسی وقت ممکن ہے جب تنہائی کی

مشکل آسان ہو۔ دیکھتے اس مشکل کی آسانی کے لئے وہ کیسی تڑپ کے ساتھ التجا کرتے

ہیں۔ ”مشکل آسان الہی مری تنہائی کی“۔ اس التجا میں کتنی درد مندی آرزو اور حسرت

کار فرما ہے۔ اس خوبصورت لہجے میں شاعرانہ حسن کے ساتھ انہوں نے اپنی دلی تمنا کا

اظہار کیا ہے کہ جس کا ایک خاص اثر مرتب ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کی

نعتیں سادہ، سہل اور عام فہم ہیں سوز و گداز ان کی شان امتیاز ہے۔ عاشقانہ جذبات سے

بھر پور، فنی نقطہ نظر سے بھی مشکل زمیوں کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے مگر عوام میں رضا

بریوی کی آسان اور سلیس نعتیں مقبول ہوئیں اور وہ آج بھی بریوی مسلک کے لوگوں

میں ورد زبان ہے جیسے رضا صاحب کا مندرجہ ذیل نعتیہ سلام ۷

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

اس سلام کے بارے میں مولانا کوثر نیازی تحریر فرماتے ہیں:-

”اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں کا نعتیہ کلام میں نے دیکھا ہے اور بالا مستیعاب دیکھا ہے۔ میں بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ تمام زبانوں اور تمام زمانوں کا پورا نعتیہ کلام ایک طرف اور شاہ احمد رضا کا سلام ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ ایک طرف۔ دونوں کو ایک ترازو میں رکھا جائے تو احمد رضا کے سلام کا پلڑا پھر بھی جھکار رہے گا میں اگر یہ کہوں کہ یہ سلام اردو زبان کا قصیدہ بردہ ہے تو اس میں ذرا بھر بھی مبالغہ نہ ہو گا۔ جو زبان و بیان، جو سوز و گداز، جو معارف و حقائق قرآن و حدیث اور سیرت کے جو اسرار و رموز، انداز و اسلوب میں جو قدرت و ندرت اس سلام میں ہے وہ کسی زبان کی شاعری کے کسی شہ پارے میں نہیں۔“ ۱۶

رضا بریلوی صاحب اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد اس انداز میں کرتے ہیں ۷

محمد منظرِ کامل ہے حق کی شانِ عزت کا
نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز و حدت کا

وہ نامی کہ نام خدا نام تیرا
رؤف و رحیم و علیم و علی ہے

دم نزع جاری ہو میری زباں پر
محمد، محمد، خدائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

انہوں نے ایک شعر میں اثرات حسن یوسفی اور عشق مصطفوی کا تقابل عجیب
انداز میں کیا ہے ۛ

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں

سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردان عرب

رضا صاحب نے صوفیانہ شعر بھی کہے ہیں۔ ان کی صوفیانہ شاعری کے مندرجہ
ذیل چند اشعار اپنی لطافت و صداقت کے اعتبار سے کتنے بالیدہ ہیں اور تصوف کے
کیسے مسائل ان اشعار کی توضیح کے پس پردہ ہیں وہ اشعار یہ ہیں ۛ

آہ وہ آنکھ کہ ناکام تمنا ہی رہی

ہائے وہ دل جو ترے در سے پرار مان گیا

یاد میں جس کی نہیں ہوش تن و جاں ہم کو

پھر دکھا دے وہ رخ اے مہر فروزاں ہم کو

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی

پھر دکھا دے وہ ادائے گل خنداں ہم کو

تنگ آتے ہیں دو عالم تیری پیتابی سے

چین لینے دے تپ سینہ سوزاں ہم کو

نیر حشر نے اک آگ لگا رکھی ہے
تیز ہے دھوپ ملے سایہ داماں ہم کو
چاک داماں میں نہ تھک جاتو اسے دستِ جنوں
پرزے کرنا ہے ابھی جیب و گریباں ہم کو
پردہ اس چہرہ انور سے اٹھا کر اک بار
اپنا آئینہ بنا اسے میرے تاباں ہم کو
اسے رضا و صف رخ پاک سنانے کے لئے
نذر دیتے ہیں چمن مرغ غزل خواں ہم کو
اسی لئے رضا صاحب کی صوفیانہ شاعری سے متاثر ہو ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تحریر
فرماتے ہیں:-

”حضرت امام احمد رضا خان صاحب کا کمال فن ہے کہ تصوف
کے مسائل دقیقہ کی توضیح کے بجائے عشق رسول کی سرمستی میں
اپنے کو گم کرتے ہیں اور جب عشق رسول میں سرشاری ہوتی تو
عرفان الہی کی آگہی ہوتی اور یہی نعت گوئی نہ صرف طریقت و
حقیقت کی سرحد چھو لیتی ہے بلکہ اس میں دلکشی اور جاذبیت
پیدا کرتی ہے۔“

قصیدہ معراجیہ:- مولانا احمد رضا خان رضا بریلوی نے ۶۷ اشعار پر مشتمل معراج
نامہ لکھا ہے جو قصیدے کے انداز میں ہے اس کی تکنیک ماقبل کے سارے معراج
ناموں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں معراج کی روایات کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ شب
معراج کا تہنیت نامہ ہے جس میں بہت آگے افکار کی نغمگی کا بہاؤ پورے
قصیدے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہوئے ہے۔

اس کی زبان نہایت سادہ، شائستہ اور بامحاورہ ہے، روزمرہ کا بر محل اور مناسب استعمال قریب قریب ہر شعر میں نظر آتا ہے۔ زبان کی سلاست یہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے کہ آیت کریمہ یا احادیث کی تلمیحات تک سے امکانی طور پر کلام کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ معراج کے ذکر میں ایسا کرنا بہت دشوار ہے۔ ایسا نہیں کہ مولانا رضا کی فکر نے ان مقامات کو چھوا نہیں جہاں تلمیح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بلکہ ان مقامات کو ایسے سلیس انداز میں بیان کرتے ہیں جہاں اس کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے اور مطلب واضح ہو جاتا ہے مثلاً قاب قوسین کی ترجمانی دیکھتے ۛ

محیط و مرکز میں فرق مشکل رہنے نہ فاصل خطوط واصل

کمانیں حیرت میں سر جھکاتے عجیب چکر میں دائرے تھے

عربی و فارسی کے ایسے الفاظ جو صوتی اعتبار سے سماعت پر گراں گزرتے ہیں بہت کم استعمال ہوتے ہیں بیشتر خالص اردو کے مترنم الفاظ مصرعوں میں نگینے کی طرح جڑے ہوتے ہیں مثلاً ۛ

خبر یہ تحویل مہر کی تھی کہ رت سہانی گھڑی پھرے گی

وہاں کی پوشاک زیب تن کی یہاں کا جوڑا بڑھا چکے تھے

اٹھی جو گرد رہ مسور وہ نور برسا کہ راستے بھر

گھرے تھے بادل بھرے تھے جل تھل امند کے جنگل ابل چلے تھے

اپنے معراج نامہ میں رضا صاحب نے عروس فن کے لب و رخسار کو خالص اردو الفاظ اور بند ثوں کے سامان آرائش سے سجایا ہے بہ الفاظ دیگر اس میں فن کے وہ تمام محاسن موجود ہیں جو ایک اچھے فن پارے میں ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ بند شیں چست اور بر محل شیریں الفاظ کا در و بست، تشبیہات کی سادگی اور نکھار، استعارات کی

جودت، لہجے میں گھلاوٹ اور وارفتگی، طرز ادا میں نفاست، جذبات میں خلوص اور بے ساختگی، فکر میں رعنائی اور رفعت، خیال کی شادابی اور طہارت ان ہی عناصر کے امتزاج سے ان کے تہنیت نامہ کے چہرہ کا غازہ تیار ہوا ہے انداز بیان کا نکھار ملاحظہ ہو۔

یہ جوشش نور کا اثر تھا کہ آب گوہر کمر کمر تھا
 صفا سے رہ میں پھسل پھسل کر ستارے قدموں پہ لوٹتے تھے
 وہ ظل رحمت وہ رخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
 سنہری زر بفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے
 اس تہنیت نامہ میں سرور و نشاط کی کیفیت نے ایک متحرک بہار یہ فضا پیدا
 کر دی ہے جس کی عکاسی رضا بریلوی نے نہایت وارفتہ اور پر کیف انداز میں کی ہے
 ان کے لہجے کی گھلاوٹ، کیف و مستی کے تصوراتی منظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے
 مجسم کر دیتی ہے اور ہم اس کی سرمستیوں کے بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں چند شعر بطور
 مثال ملاحظہ ہوں۔

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھو میں
 ادھر سے انوار ہنستے آتے ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے
 پھوٹ پڑتی تھی، ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
 وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آتے تھے
 تتی داہن کی پھبن میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا
 حجر کے صدقے کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ سے شعر میں موسیقی کا دار مدار بحر کے انتخاب پر منحصر ہے۔ رضا بریلوی کے مزاج کی نغمگی ملاحظہ کیجئے اپنے تہنیت نامہ کے لئے جن بحر کا انتخاب کیا ہے وہ ذاتی طور پر مترنم بحر ہے اس تہنیت نامے میں کوئی شعر ایسا نہیں جس میں موسیقی کا زیر و بم موجود نہ ہو اس کے سانچے میں جو ہلکے پھلکے خالص اردو الفاظ جوڑے گئے ہیں ایک سیال نغمے میں ڈھل گئے ہیں مثال ملاحظہ ہو۔

حجاب انھٹے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے پچھڑے گلے ملے تھے

براق کے نقش سم کے صدقے وہ گل کھلاتے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن بہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

زبانیں سو کھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعف تشنگی تھا کہ حلقے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

اردو کے ایک مشہور نعت گو شاعر محسن کا کوروی نے جب اس قصیدہ معراجیہ کو سنا تو حیرت زدہ ہو گئے اور اپنا قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب مستر ابادل" لپیٹ لیا اور جیب میں ڈال لیا، یہ اپنا قصیدہ رضا بریلوی ہی کو سنانے جا رہے تھے۔ اس قصیدہ معراجیہ کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر الہی بخش اختر اعوان تحریر فرماتے ہیں۔

"محسن کا کوروی کے بعد جناب رضا بریلوی تک کوئی نعتیہ قصیدہ کہنے والا شاعر نہیں آتا جو محسن کے برابر تو کیا ان کے قریب بھی پہنچا ہو۔ جناب رضا کے ہاں پہلی بار قصیدے کے وہ سچ دھج اور بلند آہنگی نظر آتی ہے جو فارسی کے عظیم المرتبت قصیدہ گو کا طرہ

امتیاز رہی ہے۔ ان کے قصیدہ معراجیہ کو پڑھتے یوں لگتا ہے کہ الفاظ و معانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے تخیل کی بلندی، فکر کی پختگی، جذبے کی شدت، الفاظ کی جزالت، بیان کی شان، انداز کی شوکت، تراکیب کا حسن، بندش کی چستی، تشبیہات و استعارات کی ندرت، معانی آفرینی، نکتہ سنجی، جذبے کی صداقت اور سب سے بڑھ کر عشق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی چمک دمک اور خلوص کی مہک ان سب عناصر نے مل کر ان کے قصیدے کو ایک ایسا فن پارہ بنا دیا ہے جس کی مثال نعتیہ قصیدہ گوئی میں بمشکل ہی دستیاب ہوگی۔^{۱۸}

محسن کا کوروی کے بعد اردو ادب میں رضا بریلوی نعتیہ قصیدہ کہنے والے اہم شاعر ہیں ان کے ہاں پہلی مرتبہ قصیدے کی وہ سچ دھج اور بلند آہنگی نظر آتی ہے جو فارسی قصیدہ گو شعراء کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی رہی ان کی یہ خوبی ان کو اہم شعراء کی صف میں جگہ دلواتی ہے ان کو میر درد، غالب، مومن، حسرت اور محسن کے بعد اردو ادب کی دنیا میں سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ رضا بریلوی کے قصیدہ معراجیہ کی خصوصیات پر مرزا نظام الدین بیگ مرٹوم نے ایک تحقیقی مقالہ سپر و قلم کیا تھا، جو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ معارف رضا ۱۹۸۵ء میں یہ مقالہ چھپ چکا ہے (ادارہ)

علم و ادب کا متوالہ، مذہبی رہنما، مختلف علوم و فنون کا ماہر اپنی تصانیف کا ایک گراں مایہ خزانہ چھوڑ کر ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء جمعہ کے دن دوپہر دو بج کر ۳۸ منٹ پر بریلی میں اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا۔

مولانا حسن رضا خان حسن بریلوی

حسن رضا خان نام اور حسن تخلص تھا ان کے والد محترم مولانا نقی علی خاں ایک بڑے عالم دین تھے۔ ۱۹ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ مولانا حسن رضا نے اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد رضا خان بریلوی ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق مروجہ علوم اپنے خاندانی بزرگوں سے ہی حاصل کئے اور معقولات و منقولات میں مہارت حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کا کام شروع کیا خاص طور سے دینی علوم کی تعلیم دیتے تھے۔

تصنیف و تالیف:- مولانا حسن ایک ممتاز مصنف و شاعر ہیں ان کی تصانیف میں ان کی غزلوں اور نعتوں کا دیوان ہے جس کو لطیف حسین ادیب نے دیوان عاشقانہ لکھا ہے اس کے علاوہ چند دوسری تصانیف و رسائل بھی شامل ہیں جس پر مذہبی رنگ زیادہ ہے۔ وہ بہار بے خزاں اور ایک ہفتہ وار اخبار روز افزوں کے نگران بھی تھے جس سے ان کے ادبی ذوق اور مذہبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی ۸ تصانیف دستیاب ہیں جن میں سے چھ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ ان کا دیوان زیر طبع تھا کہ سفر حج پیش آیا اور وہاں سے واپسی پر ۱۳۲۶ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی آٹھ مطبوعہ تصانیف یہ ہیں۔ (۱) تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین (۲) نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف (۳) بے موقع فریاد کا جواب در اثبات مستد قربانی (۴) آئینہ قیامت ذکر کربلا سے معنی (۵) دین حسن، در حقانیت اسلام، مطبوعہ

کان پور مارچ ۱۹۰۸ء۔ (۶) وسائل بخشش غوث الاعظم کی کرامات کے ذکر میں۔ (۷) ذوق نعت (مجموعہ نعتیہ کلام) (۸) ثمر فصاحت (مجموعہ کلام)

شعر و ادب:- مولانا حسن رضا خان بریلوی نثر نگار ہونے کے ساتھ ہی شاعر بھی تھے ان کے دور میں ہندوستان میں داغ کی شہرت تھی وہ رام پور میں قیام فرماتے حسن زام پور گئے وہاں اپنے پھوپھا جناب فضل حسن خان کے یہاں مقیم ہوئے اور داغ کے شاگرد ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی تحریر فرماتے ہیں:-

”شعر و سخن کا شوق حضرت حسن کو ابتداء ہی سے تھا کچھ روز تک خود مشق کرتے رہے اس کے بعد داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور ایک مدت تک رام پور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گلچینی فرماتے رہے یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار

پائے۔“

داغ کی شاگردی میں ان کی شاعری پر بڑا انکھار آیا اور اس وقت کے عام رجحان شاعری سے ہٹ کر انہوں نے نعت گوئی پر توجہ مرکوز کر دی۔ ابتدا میں ان کا رجحان ہی غزل گوئی کی طرف تھا۔

حسن بریلوی نے شاعری کی ابتدا کی تو بریلی کی فضا میں استاد داغ کا رنگ حاوی تھا اور لوگ اسی انداز کی شاعری کر رہے تھے خاص طور سے ان کے شاگردوں نے ان کے رنگ کو بڑی ہوا دی جس میں حسن صاحب ان کے بہت پیہیتے تھے۔ حسن کو بھی اپنے استاد سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار انہوں نے داغ کی موت پر مرثیہ لکھ کر کیا اور ان کی مہربانی اور شفقت کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

پیارا شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہتے

حضرت رضا اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسن بریلوی کے دیوان ”ذوق نعت“
(۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء) سے متعلق ایک قطعہ تاریخ میں کہتے ہیں۔

شرع ز شعر س عیاں، عرش بہ بیش نہاں

حسن غزل گوئی کے فن سے خوب واقف ہیں ان کو اس میں اہم مقام حاصل ہے
ان کی غزلیہ شاعری پر کشش، دلربا اور صنف سخن کی تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ
ہے ان کو اپنے وقت کا ممتاز غزل گو شاعر کہنا بے جا نہ ہو گا۔ حسن نے داغ دہلوی کی
غزل کی سوقیت دور کی زود گوئی کے باوجود غزل کی فضا کو برقرار رکھا۔ اظہار حدیث،
خلوت، خمریات، شوخی اور دیگر مضامین غزل کو باندھنے میں باوصف استاد کی تقلید میں
اپنی شاعری کو ایک تنگ دائرے میں محدود نہیں کیا بلکہ غزل کی فضا کو برقرار رکھتے
ہوئے دلی جذبات کی فطری کسک کو پیش کیا ہے بطور مثال چند شعر یہ ہیں۔

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

آرزو سے دید جاناں بزم میں لائی مجھے

بزم سے میں آرزو سے دید جاناں لے چلا

جلوہ گہ میں سیل گر یہ نے رکھا محروم دید

تشنہ لب سوکھے ہی گھاٹوں جوش طوفاں لے چلا

ڈھونڈھتی تھی ہر طرف کس کو نگاہ واپس

آس کس کے دید کی بیمار ہجراں لے چلا

اف ری متوالی جوانی کچھ خبر تجھ کو نہیں

ساغرے بوستہ لہاے جاناں لے چلا

مہنگا سستا بیچ ڈالا مال اٹھتے بیٹھتے

اک جھلک میں وہ دم آخر دل و جاں لے چلا
 کی ہیں کس کمبخت دل کے جذب نے گستاخیاں
 کون بے پردہ انہیں سوے شبستاں لے چلا
 میرے گھر تک پاؤں پڑ کر ان کو لایا تھا نیاز
 ناز دامن کھینچتا سوے رقیباں لے چلا
 دل کو جاناں سے حسن سمجھا بجھا کر لاتے تھے
 دل ہمیں سمجھا بجھا کر سوتے جاناں لے چلا

کس نے سنایا اور سنایا تو کیا سنا
 سننا ہوں آج تم نے مرا ماجرا سنا
 قاصد ترے سکوت سے دل بیقرار ہے
 کیا اس جفا شعار نے تجھ سے سنا کیا
 آخر حسن وہ روٹھ گئے اٹھ کے چل دیئے
 کمبخت اور حال دل بتلا سنا
 دم مردن تیرے قدموں پہ اگر سر ہوتا
 حشر میں تاج کرامت مرے سر پر ہوتا
 کیا کہوں طول شب ہجر ستمگر تجھ سے
 کچھ جو ہوتا تو تری زلف سے بڑھ کر ہوتا
 آپ کیا کہتے ہیں دشمن کے برابر ہو حسن
 خوب ہوتا جو ہیں ان کے برابر ہوتا

غرض کہ حسن کا عام رنگ وہی ہے جو ان کے استاد داغ کا تھا "شمر فصاحت" (مجموعہ کلام حسن) میں وہ داغ کا کامیابی سے اتباع کرتے ہیں۔ بانگین، تیکھاپن، جنسی عشق، واردات، بات میں بات، محاکات وغیرہ جو داغ کی شاعری کی امتیازی خوبیاں ہیں حسن کے یہاں بھی ملتی ہیں کہیں کہیں وہ اس رنگ سے ہٹ کر بھی کہتے ہیں مثلاً ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

ہم لگی دل کی بجاتیں کیوں
عشق کو آگ لگاتیں کیوں کر

اور اسی طرح کی دوسری غزلوں میں ان کا رنگ داغ سے مختلف ہے حسن کی شہرت نہ صرف غزل گو کی حیثیت سے اردو شاعری میں تسلیم کی جاتی ہے بلکہ نعت گوئی کی حیثیت سے وہ اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

حسن رضا خاں کے زمانے ہی میں نعتیہ مشاعروں کا رواج پڑا ان سے قبل بریلی کے مشاعروں میں بطور ہدیہ تبریک حمد و نعت و منسبت خوانی ہوتی تھی جب حسن کی نعت گوئی نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی اور بریلی میں نعت گوئی کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی تب نعت گوئی کے لئے مشاعرے بھی عام طور پر منعقد ہونے لگے اور مقبول ہوئے۔

حسن رضا خاں کے زمانے سے ہی مشاعروں میں مزاح نگاروں نے اپنا کلام پڑھا اس کا آغاز یوں ہوا کہ حسن سے ایک ہزل گو، خنداں وابستہ تھے، اور حکیم عبدالصمد سرشار سے ایک سقہ، جن کا تخلص فلفل تھا، مشاعروں میں ہردو گردپوں کی طرف سے یہ ہزل گول پیش ہوتے اور سامعین کے لئے انبساط کا سامان فراہم کرتے۔ بحیثیت مجموعی بریلی میں اردو شاعری کا وہ دور جس کا آغاز حسن رضا کے ساتھ ہوا اور جس کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہوا، ایک دلچسپ رنگارنگ اور ہمہ جہتی کا دور تھا۔

حسن رضا خاں کی تعلیم و تربیت، مذہبی ماحول، با عمل زندگی اور شعر گوئی کی فطری صلاحیت کا تقاضا۔ ہی تھا کہ وہ نعت لکھتے چنانچہ انہوں نے نعت گوئی میں بھی وہ امتیاز پایا کہ باید و شاید۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ”ذوق نعت“ (۱۳۲۵ / ۱۹۰۷ء) دسویں بار طبع ہو چکا ہے ان کے تحریر کردہ نعتیہ کلام اور نعتیہ غزلیں برصغیر ہند و پاک میں یکساں طور پر مقبول ہیں حسن کے نعتیہ کلام پر داغ کی اصلاح نہیں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد رضا خان نے ضرور ان کی نعتوں کو کبھی کبھار بہ نظر اصلاح دیکھا ہے او ان کی نعتوں کے مداح تھے مولانا احمد رضا صاحب نے اپنے ملفوظات میں صرف دو نعت گویان اردو یعنی کافی مراد آبادی اور حسن کی تعریف کی ہے۔

حسن عالم دین تھے، نیک اور پرہیز گار مسلمان بھی تھے۔ ان کے سینے میں ایک گداز قلب تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی حسنین رضا خاں نے بتایا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر گرامی سن کر ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ فریضہ حج انہوں نے وفات سے سات ماہ قبل ادا کیا تھا اور حسن مدت میں انہوں نے ”ذوق نعت“ مرتب کیا ان کی حالت غیر سی رہی اور خاص کیفیت طاری رہی جس کا اظہار ان کی نعتوں میں بار بار ہوا یہ حالت عشق نبی کی وجہ سے تھی جس میں فنایت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہ قلبی کیفیت تھی جس کے اظہار کے لئے غزل سب سے زیادہ موزوں تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں ان کے جذبات غزل کی زبان اور غزل کی اشاریت کے سہارے اس قدر مقبول ہوئے کہ اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے اپنے اس مخصوص انداز کی وجہ سے وہ مستقدمین سے زیادہ ممتاز اور مشہور ہوئے۔ انہوں نے اپنی نعتیہ غزلوں میں جذبات، تجربات اور مشاہدات کو نظم کیا اس طرح وہ محض نعت کے نہیں روح نعت کے شاعر تھے۔۔۔۔۔ نعتیہ اشعار کے چند نمونے یہ ہیں۔

نگاہ لطف کے امید وار ہم بھی ہیں
 لئے ہوتے یہ دل بے قرار ہم بھی ہیں
 ہمارے دست تمنا کی لاج بھی رکھنا
 ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں
 ادھر بھی تو سن اقدس کے دو قدم جلوے
 تمہارے راہ میں مشیت غبار ہم بھی ہیں
 کھلا دو غنچہ دل صدقہ باد دامن کا
 امیدوار نسیم بہار ہم بھی ہیں
 تمہاری ایک نگاہ کرم میں سب کچھ ہے
 پڑتے ہوتے تو سر رہز ہم بھی ہیں
 جو سر پر رکھنے کو مل جاتے نعل پاک حضور
 تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں
 حسن ہے جس کی سخاوت کی دھوم عالم میں
 انہیں کے تم بھی ہو اک ریزہ خوار ہم بھی ہیں

دل میں یاد تیری گوشتہ تنہائی ہو
 پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو
 آستانے پہ ترے سر ہو اجل آتی ہو
 اور اے جانِ جہاں تو بھی تماشائی ہو
 بزم آرا ہوں اجالے تری زیبائی کے
 کب سے مشتاق ہیں آئینے خود آرائی کے

خاک ہو جائے اگر تیری تمناؤں میں
 کیوں ملیں خاک میں ارمان تمنائی کے
 اس دل کے فدا جو ہے تری دید کا طالب
 ان آنکھوں کے قربان جنہیں تو نظر آیا
 ایسا تجھے خالق نے طردار بنایا

یوسف کو ترا طالب دیدار بنایا
 اے نظم رسالت کے چمکتے ہوئے مقطع
 تو نے ہی اے مطلع انوار بنایا

یہ لذت پابوس کہ پتھر نے جگر میں
 نقش قدم سید ابرار بنایا
 اگر قسمت سے ان کی گلی میں خاک ہو جاتا
 غم کونین کا سارا بکھیرا پاک ہو جاتا
 وہ کیا مرتبہ ہوا تیرا
 تو خدا کا خدا ہوا تیرا
 اے چمن بھیک ہے تبسم کی
 غنچہ غنچہ کھلا ہوا تیرا
 سوکھے گھاٹوں مرا اتار ہو کیوں
 کہ ہے دریا چڑھا ہوا تیرا

ذوق نعت کی شنویوں میں قابل ذکر شنوی وسائل بخشش ہے جس میں ۶۰۲ اشعار
 ہیں اور اس میں نعت کے علاوہ مناقب بھی ہیں۔ اس شنوی کا انداز شنوی کی فضا کے
 مطابق غزل سے اور خاص طور پر داغ اسکول کی غزل سے بالکل مختلف ہے۔

حسن بریلوی ایک عمدہ غزل گو، ممتاز نعت نگار اور شتوی نگار شاعر ہیں۔ انہوں نے بریلی میں جو شمع ادب روشن کی اس کے نور سے آئندہ نصف صدی تک شعراء فیضیاب ہوتے رہے ان شعراء میں حکیم سید برکت علی نامی، منشی دوار کا پرشاد حلم بریلوی، حافظ و ہاج احمد، محشر، سید محمود علی عاشق، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سید مسعود غوث فیض، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین اثر بدایونی اور منشی اعجاز احمد قیصر مراد آبادی وغیرہم کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۳)

مولانا عبد السمیع بیدل رام پوری

نام عبد السمیع تخلص بیدل ہے۔ بیدل قصبہ رام پور منہیاراں ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے ان کے والد شیخ محمد یوسف مشہور طبیب تھے ان کا سلسلہ نسب حضرت ابی ایوب خزرجی انصاری صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہو کر نضر بن کنانہ سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں، جا ملتا ہے۔

پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی پھر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مولانا عبد السمیع بیدل ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں دہلی پہنچے اور علوم معقول و منقول مفتی صدر الدین آزرہ اور دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کئے انہوں نے فارسی کی تعلیم صہبائی سے حاصل کی، اردو عربی اور حدیث و تفسیر کی آزرہ سے۔ ان کے علاوہ مولانا احمد علی سہارنپوری، مولوی سعادت علی سہارنپوری، مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا قاسم نانوتوی سے بھی کچھ استفادہ کیا اور علوم مروجہ میں درجہ کمال حاصل کیا۔

مولانا عبد السمیع بیدل اپنے زمانے کے نامور عالم اور مصنف تھے۔ مؤلف تفسیر ابر کرم لکھتے ہیں:-

”عالم باعمل مبرا از حرص و امل، عشاق رسول اللہ، اعلیٰ درجہ کے مصنف، حدیث و تفسیر و فقہ میں کمال رکھتے تھے، زہد و تقویٰ بدرجہ غایت ہے دیانتدار، متقی، امین، خدا ترس، متین، کم گو، متواضع، بامروت آدمی ہیں۔۔۔۔۔ کلمہ خیر کہنے سے درگزر نہیں کرتے، اخلاق بدرجہ غایت، سچ ہے ایوں ہی کا ہونا زینت اسلام ہے۔“

سات برس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسب معاش کا مرحلہ پیش آیا سب سے پہلے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۱۸۶۱ء) میں رڑکی ضلع سہارن پور میں ایک برہمن ٹھیکیدار کے بیٹے ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت پر مامور ہوئے۔ نوجوان ناہر سنگھ نے ان کی بزرگی اور زہد و ورع اور دینداری و تقویٰ سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا خلیل الرحمن ان کا نام رکھا گیا۔ جب یہ خبر ناہر سنگھ کے خاندان تک پہنچی تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عبد السمیع کو ملازمت سے برطرف کر دیا ناہر سنگھ پر بھی بہت سختی کی گئی لیکن اس نے استقامت کا ثبوت دیا اور اپنے اعتقاد پر قائم رہا۔

مولانا عبد السمیع رڑکی سے محل کر اپنے وطن پہنچے۔ انہیں دنوں میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہندوستان آتے ہوئے تھے مولانا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے حاجی صاحب نے ان کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر انہیں اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا۔ میرٹھ کے رئیس شیخ الہی بخش (لال کرتی) نے اپنے بھتیجوں کی تعلیم کے لئے بلا لیا اور انہوں نے وہیں عمر گزار دی شیخ الہی کے پوتے شیخ شمس الدین میرٹھی تحریر فرماتے ہیں:-

”میرٹھ تشریف آوری سے قبل کچھ عرصہ رڑکی میں قیام پذیر رہے وہاں سے بلدہ میرٹھ بسلسلہ ملازمت آنا ہوا۔ یہاں جناب شیخ الہی بخش مرحوم رتیں اعظم نے اپنے برادر زادگان شیخ غلام محی الدین صاحب، وحید الدین صاحب اور بشیر الدین صاحب کو پڑھانے کے واسطے حضرت کو متعین فرمایا مولانا نے تقریباً چالیس سال اپنی عمر کا بقیہ حصہ یہیں ختم کر دیا۔۔۔۔۔ دوران قیام میرٹھ میں آپ کو کلکتہ، کانپور اور ٹونک سے صدر مدرس مدارس کے لئے وافر مشاہراہ پر بلایا گیا لیکن حضرت نے بوجہ محبت اس خاندان کے انکار کر دیا مولانا بڑے متبع شرع، متقی، عالم، فاضل اہل اللہ سے تھے۔“ ۲۲

مولانا عبد السمیع نے اپنی زندگی کے آخری ۴۲ برس میرٹھ میں بسر کیے۔۔۔۔۔ ہیں مشکل یکم محرم ۱۳۱۸ھ (۱ مئی ۱۹۰۰ء) کو انتقال کیا۔ قبرستان مخدوم شاہ ولایت کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادے محمد میاں تھے۔ معاصرین بیدل میں بیان یزدانی اور شوکت میرٹھی معروف ہیں۔

تصنیف و تالیف:- مولانا عبد السمیع بیدل ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے تمام عمر مذہبی کتابوں کی تصنیف کرتے رہے مولانا مرحوم کی درجہ ذیل ۱۲ مطبوعات کا پتہ چل سکا ہے۔ (۱) دفع الا وہام فی محفل خیر الانام (لکھنؤ ۱۲۹۶ھ) (۲) انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ (میرٹھ: ۱۳۰۲ھ) (۳) راحۃ القلوب فی مولد المحبوب (دہلی: ۱۲۹۰ھ) (۴) بہار جنت (میلا د شریف) (کانپور: ۱۳۱۰ھ) (۵) سلسبیل فی مولد ہادی سبیل (میلا د نظم) (میرٹھ: ۱۳۱۲ھ) (۶) نور ایمان (نعتیہ کلام) (میرٹھ

۱۳۱۲ھ) (۷) حمد باری (۸) طراز سخن، مجموعہ کلام (میرٹھ : ۱۳۱۴ھ) (۹) جوہر لطیف (نعتیہ مثنوی) (میرٹھ : ۱۳۲۷ھ) (۱۰) فیضان قدسی (فضائل آیتہ الکرسی) (دلی : ۱۳۲۷ھ) (۱۱) وسیلہ معفرت (مجموعہ ادعیہ) (۱۲) مظہر حق (مسائل دینیہ منظوم) یہ سب کتابیں اردو زبان میں ہیں۔

دفع الاوہام فی محفل خیر الانام:- مولانا عبد السمیع بیدل نے محفل میلاد کی تائید میں یہ رسالہ لکھا ہے اور معترضین کے جواب دیتے ہیں یہ رسالہ اردو نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے :-

کر کے مالک کا شکر پڑھ کے درود

کرتا ہوں ذکر محفل مولود

موسو! یاں ادب سے آؤ تم

عطر خلت بسا کے لاؤ تم

ذکر خیر الوری کی محفل ہے

مولود مصطفیٰ کی محفل ہے

محفل ابن شاہ ذی حشم کی ہے

محفل اس شافع امم کی ہے

پھیلا آفاق میں ہے جس کا نور

اسی نور خدا کا ہے مذکور

وصف حضرت کا جان سے دل سے

سنو آکر زبان بیدل سے

اس کتاب کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوا ہے :-

جو مری شتوی کی سیر کریں

میرے حق میں دعائے خیر کریں

مجھ کو حق جس طرح ہوا معلوم

اس صحیفہ میں کر دیا مرقوم

کام اپنا ہے امر حق کہنا

گر معاند لڑے تو چپ رہنا

گر کوئی اس میں رد و قدح کرے

نہیں ہر گز ملال اس کا مجھے

اپنا شیوہ نہیں ہے جنگ و جدل

کس و ناکس سے کرنا رد و بدل

بس سلامت روی ہے کام اپنا

دوست دشمن کو ہے سلام اپنا

صلح کی حق نے دی ہے تو مجھ کو

مرجا کہتے ہیں عدو تجھ کو

اب تمامی پہ آیا اپنا کلام

بھیجوں حضرت پہ میں درود و سلام

حمد باری:- فارسی کی ابتدائی نصابی کتابوں میں خالق باری مشہور ہے مگر اس میں

سنسکرت، ہندی اور پنجابی کے اکثر ثقیل الفاظ ہیں جن کے سمجھنے میں طلبہ کو دقت

ہوتی ہے مولانا عبدالسمیع نے اسی درسی ضرورت کے تحت خالق باری کے طرز پر

ایک کتاب حمد باری لکھی۔ رسالہ حمد باری میں مندرجہ ذیل عناوین پر مناجات

منظوم کی گئی ہیں۔ (۱) در بیان آسمان و متعلقات آں (۲) در بیان سال و ماہ و غیرہ (۳) در بیان زمین و انچہ در آنست از معادن و بحار و اماکن (۴) در بیان اثاث البیت یعنی اسباب ضروری خانہ و دیگر عناوین۔

وسلیہ معفرت :- اس رسالہ میں نماز، ضروری سورتیں، ایمان مجمل و مفصل، چھ کلمات اور ادعیہ ماثورہ مع اردو ترجمہ درج ہیں۔

انوار ساطعہ :- ۱۳۰۲ھ میں بعض علمائے دیوبند و گنگوہ و سہارن پور و غیرہ کی طرف سے یکے بعد دیگرے دو فتوے میلاد و فاتحہ و غیرہ کے رد میں مطبع ہاشمی میرٹھ کے ذریعہ طبع کرا کے شائع ہوئے تو مولانا عبد السمیع بیدل نے ان فتووں کے رد میں ایک مفصل کتاب ”انوار ساطعہ در بیان مولود و فاتحہ“ تحریر فرمائی ان فتووں کے بارے میں خود صاحب کتاب لکھتے ہیں :-

”تیرہویں صدی میں لوگوں کا حال کیا غضب تھا اب چودہویں شروع ہوتی دیکھتے کیا قیامت ہو۔ دنیا میں کیا خرابی اور دین میں کیا مصیبت ہو۔ ۱۳۰۲ھ تیرہ سو دو ہجری میں دہلی کے تین علماء غیر مقلد اور علمائے دیوبند و گنگوہ و سہارن پور کی حسن توجہ سے اور مطبع ہاشمی میرٹھ کی سعی سے ایک فتویٰ چار ورق پر چھپ کر اکثر اطراف میں تشریح کیا گیا اس کی لوح سر نوشت یہ تھی (فتویٰ مولود و عرس و غیرہ)“ - ۲۳

یہ کتاب میلاد پاک اور فاتحہ و غیرہ کی اثبات میں ہے اور اس میں اس کے مخالفین کی تردید کر کے جواز مولود اور فاتحہ و غیرہ کو عقلی اور نقلی دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے اس کی اثبات میں ان ۳۷ محدثین و فقہا کا ذکر ہے جنہوں نے مولود کو مستحب و

مستحسن فرمایا ہے جواز مولود میں مفتیان حرین کے فتاویٰ بھی درج ہیں یہ فتوے عربی زبان میں ہیں اور اس کے علاوہ بغداد کے فتوے بھی ہیں۔

کتاب کے آخر میں حاجی امداد اللہ اور دوسرے مشہور عالموں کی تقریظیں، تصدیقیں اور تائیدیں شامل ہیں اس سے پہلے مناہات ختم کتاب ہے۔

شعر و ادب :- مولانا عبد السمیع بیدل ایک اچھے شاعر بھی تھے انہوں نے ۱۲۷۰ھ

/ ۱۸۵۳ء میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا خواجہ احمد فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

”شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ بیدل نے

۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا۔“ ۲۴

ابتداء میں مولانا بیدل کا رجحان عشقیہ شاعری کی طرف تھا مگر حاجی امداد اللہ کی

صاحب سے بیعت کے بعد نعت و منسبت کی طرف رجوع ہوئے ان کا جتنا کلام ملتا

ہے نعت و منسبت ہی میں ملتا ہے چنانچہ مالک رام تحریر فرماتے ہیں:-

”شاعری کے آغاز میں بیدل بھی رسمی غزل کی طرف زیادہ

متوجہ رہے لیکن جوں جوں مذہب سے شغف بڑھتا گیا اور

بالخصوص حاجی امداد اللہ سے بیعت کے بعد نعت و منسبت سے

زیادہ مزاوت رہنے لگی۔“ ۲۵

مولانا عبد السمیع کا بیشتر کلام منظوم ان کی آخری ایام کی ہے تو جہی کے باہت

ضائع ہو گیا۔ ان کے شاگرد جن کا تخلص تسخیر ہے انہوں نے ان کا کلام بڑی محنت

سے جمع کر کے اس کو ”طراز سخن“ کے نام سے ۱۸۹۶ء میں میرٹھ سے شائع کیا۔

نمونہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شہر افشاں ادہرب ہیں، ادھر آنسو برستے ہیں

تماشا جس طرح برسات میں ہو برق باراں کا

نمود ذرہ بے خورشید کب ممکن ہے اسے بیدل
سبب حسن قدم ہے گرمی بازار امکاں کا

بیدل کے یہاں خاکساری بہت بڑی چیز ہے وہ کہتے ہیں ے

کیا کہوں جو خاکساری میں ہے، اسے بیدل بہار

مل کے دانہ خاک میں کیا سبز و رعنا ہو گیا

مت خون پہ بیدل کی کمر باندھ، کہ وہ تو

اک طا تر بے بال ہے سو عجبی کوئی دم ہے

کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے

مدعا کوئی بر نہیں آتا

شبہم کو رونا آتا ہے انجام دیکھ کر

غفلت سے مسکراتا ہے غنچہ گلاب کا

وحدت کی رمز کھل نہ سکے بے فنا ہوتے

دریا سے وصل ٹوٹ کے ہووے حباب کا

تھا ابھی وصل، پھر جو آنکھ کھلی

یار آغوش سے جدا دیکھا

دار فانی میں آدمی کیا ہے

پہتے پانی میں بلبلا دیکھا

کیا کہوں کس کس نصیبت سے چلا پیمانہ رات

چرخ نے گھیرا تھا چکر باندھ کر خمخانہ رات

کیا مصیبت میں کسی کا ساتھ دیتا ہے کوئی
 دل کو سمجھے تھے یگانہ، ہو گیا بے گانہ رات
 شمشیر الم دیکھ کے غش آتے ہے جن کو
 یارب! مجھے لائیں گے وہ کیونکر تہ خنجر
 اگر بلا وہ ہیں تو ہم بھی ہیں جفاکش، دیکھیں
 پیچ و خم دیں گے ہمیں آپ کے گیو کب تک

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں
 جان پر میری کیا عذاب نہیں
 دل دیا حق نے وہ کہ ہے بیتاب
 آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں
 یہاں یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں
 وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
 اپنے عاشق کی بیہوشی مت پوچھ

دن کو آرام شب کو خواب نہیں
 شعلہ رو تیری گرم خوتی سے
 کو نسا دل ہے جو کباب نہیں
 مختصر یہ حال بیدل کا

تن میں طاقت، جگر میں تاب نہیں
 ان کے یہ اشعار ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہیں جس کو غالب کی صحبت کا
 فیض کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا غالب جیسے استاد کی رہنمائی نے ان کی شاعری کو جلا

نجشی۔ ان کی شاعری میں غالب کارنگ و آہنگ ہے اور وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اردو شاعری کے لئے اہم مانی جاتی ہیں حالانکہ وہ مذہب سے زیادہ قریب تھے اور انہوں نے اپنی پوری توجہ اس پر ہی مرکوز کر دی تھی۔ کاش مذہب کی طرح غزل گوئی پر بھی دھیان دیا ہوتا تو ان کی شاعری کا کچھ اور ہی رنگ و روپ ہوتا پھر بھی اردو شعر و ادب کی دنیا میں وہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

(۴)

مولانا عبد اللعیم آسی غازی پوری

عبد اللعیم نام اور تخلص آسی تھا۔ ان کا تاریخی نام ظہور الحق تھا ابتداء میں وہ عاصی تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اپنے پیرو مرشد مولانا شاہ غلام معین الدین کے حکم سے آسی کر دیا۔ مولانا عبد اللعیم آسی غازی پوری ۱۹ شعبان ۱۲۵۰ھ کو سکندر پور ضلع بلیا (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا نام حضرت شیخ قنبر حسین قدس سرہ تھا آپ کے جد مادری کے بزرگ حضرت بندگی شیخ مبارک قدس سرہ تھے۔ آسی کا ناہال قاضی پورہ ضلع آرہ (بہار) میں تھا۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت کچھنا بی بی مفتی احسان علی جو آسی کے استاد بھی تھے، کی پوتی تھیں غرض وہ باعزت خاندان کے چشم و چراغ تھے جو عوام و خواص دونوں کا منظور نظر تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔

آسی نے عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں مولانا عبد اللعیم فرنگی محلی لکھنوی سے پڑھی ان کی ذہانت سے مولانا بہت خوش رہتے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے حضرت آسی "خانقاہ رشیدیہ" ۲۶ جون پور ۱۶۲۸ھ میں جا کر ایک عرصہ تک وہیں

پڑھتے رہے۔ اس وقت خانقاہ رشیدیہ جون پور میں آسی کے پیر و مرشد مولانا غلام معین الدین بھی موجود تھے ان سے تعلیم حاصل کی بالآخر حضرت آسی مدرسہ حنفیہ جون پور میں معقول اور منقول کی ساری کتابیں مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی سے پڑھیں آگے چل کر وہ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین بھی ہوئے۔ آسی کے مزاج میں خاکساری و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی ان کا رجحان تصوف کی طرف بھی رہا جس کی شاہدان کی شاعری ہے۔

شعر و ادب:- مولانا عبدالعظیم آسی اردو ادب کی دنیا میں ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ یوں تو ان کی شاعری کے علاوہ ان کی نثری خدمات بھی ہیں لیکن شاعری کے مقابل نہیں ٹھہرتی۔ شاعری کے میدان میں انہوں نے اپنا الگ اور منفرد مقام بنایا۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا یعنی آسی ایک فطری شاعر تھے جون پور سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ان کی ابتدائی شاعری بھی لائق ستائش اور قابل داد ہے۔ آسی کے وقت کے مشہور شاعر شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی (سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آبادی) جو ناخ کے قریبی شاگردوں میں تھے، ایک بار آسی نے بھی اپنا کلام جون پور کے قیام میں ہی افضل الہ آبادی کو دکھلایا، افضل صاحب نے ان کی غزلوں کو بہت ہی غور و فکر سے دیکھا اور ان کی ذہانت کی داد دی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد آسی کو اصلاح کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر ادباً وہ غزلیں افضل صاحب کے پاس بھیجتے رہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے کہ آسی صاحب افضل کے شاگرد ہیں اور افضل صاحب ناخ کے شاگرد ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسی کا سلسلہ تلمذ مشہور زمانہ شاعر ناخ سے جالمتا ہے آسی نے اپنے ایک شعر میں اپنے استاد کا ذکر یوں کیا ہے ۷

آسی منموم کو ہے یاد قول اوستاد
 خستگی سبٹین کی اے افضل آتی ہے جو یاد
 آسی کی شاعری کا موضوع تصوف ہے وہ مسائل تصوف اور تصوف کی باتوں
 کو قالب شعر میں ڈھال کر لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن بڑا شاعر بننے کی تمنا انہوں
 نے کبھی نہیں کی آسی کا یہ شعر اس کا ترجمان ہے ۔

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ میرا کام ہے یہ
 قالب شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ
 آسی کے نزدیک شاعری وہی ہے جس میں حقیقت کا بیان مجاز کے ساتھ ہو اور
 مجاز کا بیان حقیقت کے ساتھ ورنہ وہ شاعری لغو ہے وہ خود فرماتے ہیں ۔
 اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
 وہ شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا
 آسی نے اپنی شاعری کو لفظی بازی گری میں نہیں الجھایا بلکہ رنگ تغزل سے
 اپنے کلام کو ہر دلعزیز بنا دیا مثلاً ۔

بال اپنے اسیروں کے جکڑ لیتے ہیں
 غضب ہوتے ہیں زلفوں میں پھنسانے والے

اب کہیں آسی نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
 کیا ہو کنگرہ - عرش ہلانے والے

آسی اپنے وقت کے عارف کامل اور قادر الکلام شاعر تھے اردو شاعری کی نمایاں
 خدمات انجام دیتے ہوئے انہوں نے ہزاروں کو فیض یاب کیا جن میں شمشاد لکھنوی،
 عبدالصمد، سید محمد غازی پوری، احمد حسین لبیب سکندر پوری وغیرہ بہت ممتاز تھے۔
 آسی کے کلام کی مجموعی خصوصیت گم گستگی اور تبہل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ

کر محبوب کی طرف نہ صرف آ جاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ لیکن یہ محویت کوئی مجہول کیفیت نہیں ہے اسی کے وہاں عشق ایک جداگانہ مذہب ہو گیا ہے اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی انجیل سمجھنا چاہیے ان کا پیغام یہ ہے کہ عشق کے بغیر زندگی بے کیف ہے ایک شعر میں کہتے ہیں ۔

عین معنی ہے وہ دل عاشق معنی جو ہوا

ہائے وہ لوگ جو دل دادہ - صورت بھی نہیں

آسی عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث میں نہیں پڑتے۔ عشق چاہے کوئی ہو عشق ہی ہے جس میں درد دل اور درد جگر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور توفیق پر منحصر ہے۔ آسی نے واضح لفظوں میں کہیں یہ تعلق نہیں کی ہے مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ عشق مقصود بالذات ہے جو تمام صفتوں سے بالاتر ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ شخص جو آسی کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے عام ازیں کہ وہ شعور محبت کی کس منزل پر ہے آسی کی شاعری کو اپنے سے بہت قریب پاتا ہے ۔

آسی مست کا کلام سنو

و عظ کیا پند کیا نصیحت کیا

اسی لئے مجنوں گورکھ پوری نے لکھا ہے:-

”مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں نظر آتی ہیں

جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کا حقد، تسلیم کیا ہے

اور جن کے مسلک کو ”مجازیت“ کہا جا سکتا ہے ایک تو حافظ

شیرازی، دوسرے آسی۔۔۔۔ آسی کے وہاں تصوف اور تغزل

حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کر حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز
والے مجاز سمجھتے ہیں۔ ۲۷

آسی کا معیار عشق کیا ہے؟ اس کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے مثلاً یہ شعر

ملاحظہ ہو

عاشقی میں ہے محویت در کار
راحت وصل و رنج فرقت کیا
نہ گرے اس نگاہ سے کوئی

اور افتاد کیا مصیبت کیا

یعنی عشق کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ عاشق معنوق کی یاد میں فنا ہو جائے اور اسے
معنوق کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔۔۔

حضرت میر کی شاعری کی خصوصیت درد سے بھری حزنیہ شاعری ہے آسی بھی
اسی درد کے قائل ہیں جو میر کی غزل میں پایا جاتا ہے۔

اس طرح درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو

سخن آسی شیدا غزلِ میر نہ ہو

وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے

وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کش تاثیر نہ ہو

آسی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے
کلام کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے، تشبیہات و
استعارات کی شاعری دنیا میں بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے مگر آسی کے دل میں
کیفیت پہلے ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سوچتے

ہیں اسی لئے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اسی کے کلام میں تشبیہات، استعارات و کنایات وغیرہ کی بھرمار ہے اس کا ثبوت مندرجہ ذیل کے چند اشعار میں ملتا ہے۔

شہید ہوں چشم زرگسین کا، نیاز مند اپنے ناز میں کا
مزا ہے لب ہائے شکر میں کا، ہے نام میں قند و انگبین کا
نہ وصف پوچھو رخ حسین کا، کہ نخل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا، سو ایک نافہ ہے مشک چہیں کا

نہ بات میں کیوں ہو شان شیریں، بنی ہے مصری لسان شیریں
لکھوں جو وصف لبان شیریں، قلم کے صدقے ہو جان شیریں
نہ کیسے میرا بیان شیریں، ہو جوئے شہد روان شیریں
ز بسکہ وصف دہان شیریں، رہا ہے ورد زبان شیریں
بدن میں جب تک ہے جان شیریں، مزادہن میں ہے انگبین کا

چراغ خور اس کے چہرہ سے گل، کمر رگ گل ہے بے تامل
زمین کو چال سے تزلزل، فلک کو پہونچا ہے گھنگرو کا غل
وہ روئے خنداں ہے جان بلبل، قد خراماں سے سرو صلصل
وہ چشم فشاں ہے غیرت گل، وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل
عذار میں ہے صباحت گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

ہے سنبل موئے زلف حوراں، جگر میں جو ہے دود پیچاں
ہے نہر تسنیم چشم گریاں، تو رشک طوئی ہے نخل حراماں
جسد کے گل ہائے زخم خنداں، نہ کس طرح ہو نصیب بستاں

ز ہے جوش داغ ہجراں، ہوا مرا سینہ باغ رضواں
برائے گل گشت جائے غلماں، خیال پھرتا ہے اک حسیں کا

شمع کے مانند ہے اپنا بھی کیا سوز و گداز
صورت پروانہ دشمن ہم سے جل جاتے ہیں کیوں
مرغِ جاں طعمتہ شاہین اجل ہو جائے
باز ہم عشق سے تیرے نہیں آنے والے
چال آفت ہے تو پازیب کی جھنکار غضب
آئیے فتنہ محشر کے جگانے والے

ہر ایک لفظ میں ایسی کشش ہے کہ سامع کا دل خود بخود کھینچتا چلا جاتا ہے ساتھ ہی
تصوف کی بنیاد عشقِ حقیقی سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہتی۔ اسی نے کوزے میں
سمندر بھر دیا ہے یعنی تفصیل کو اجمال کر دیا ہے یہ خصوصیت بھی ان کی شاعری میں
پائی جاتی ہے مثلاً فرماتے ہیں :-

رات ہے رات تو بس مرد خوش اوقات کی رات
گریہ - شوق کی یا ذوق مناجات کی رات
ہم گدایان در پیر خرابات کی رات
ہے شب قدر سے دعوائے مساوات کی رات
گریہ - غم ہے کہ ساون کی جھڑی تادم صبح
کوئی موسم ہو یہاں رہتی ہے برسات کی رات
اب تو پھولے نہ ساتیں گے کفن میں اسی
ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

وحدت الوجود تصوف کا ایک اہم مسدہ ہے جس کا مطلب ہے لا موجود الا اللہ
یعنی اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں آسی شاعرانہ رنگ میں فرماتے ہیں ۛ

وحدت جسے کہتے ہیں وہی کثرت ہے

کثرت جسے سمجھے ہو وہی وحدت ہے

واصل ہے نہ موصول نہ گنجائش وصل

محفل ہے نہ خلوت ہے عجب صحبت ہے

آسی کو دنیا میں ہر جگہ خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسی لئے انہوں نے کیا خوب کہا ہے ۛ

وہ کیا ہے ترا جس میں جلوا نہیں ہے

نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں ہے

آسی اپنے محبوب کی الفت میں دم نکلنے جانے کی آخری تمنا کرتے ہیں ۛ

ہر اک طالب دین ہے طالب فنا کا

کہ جب ہم نہیں آپ دنیا نہیں ہے

کل جائے دم اس کی الفت میں آسی

سوا اس کے اب کچھ تمنا نہیں ہے

”بیان جادو ہے“ کے تحت آسی نے بھی اپنی شاعری میں جادو جیسی خصوصیت

پیدا کر دی ہے جس سے ہر قاری متاثر اور لطف اندوز ہوتا ہے وہ خود فرماتے ہیں ۛ

قالب نظم میں جو پھونک دے جان اے آسی

نہ وہ عیسیٰ ہیں نہ موسیٰ، وہ ہمارا دم ہے

شاعر کا خیال ہے کہ سچے عاشق کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اپنی زندگی معشوق کے

در پر ہی گزار دے اور انجام کی پرواہ نہ کرے ۛ

صورت نقش قدم میٹھے ہیں کوچے میں تیرے
 دیکھیں کس طرح اٹھاتے ہیں اٹھانے والے
 جیتے جی کون ترے در سے اٹھا سکتا ہے
 بس اٹھائیں گے جنازے کے اٹھانے والے
 آسی کے نزدیک صوفی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دنیاوی ذات پات کے
 جھگڑے میں الجھے بلکہ اس کا دھیان صرف اور صرف معشوق کی طرف ہو اور وہ
 معشوق کے سوا کسی اور کو نہیں جانتا ہو کہ کون اس کا دوست ہے اور کون دشمن، بطور
 مثال یہ شعر ملاحظہ ہو۔

پہچانتا وہ اب نہیں دشمن کو دوست سے
 کس قید سے اسیر محبت رہا ہوا
 اس کا پتہ کسی سے نہ پوچھو بڑھے چلو
 فتنہ کسی گلی میں تو ہو گا اٹھا ہوا
 صوفیوں نے اپنے احساس کو اہل دنیا تک پہنچانے اور انہیں سمجھانے کے لئے
 بہت سے دنیاوی رسم و رواج اور قصے کہانیوں کا سہارا لیا ہے، فارسی کے مشہور شاعر
 سنائی، فرید الدین عطار، جلال الدین رومی، نظامی، عمر خیام، حافظ، جامی وغیرہ نے
 صوفیوں کی حقیقت کو بتانے کے لئے یوسف، زلیخا، مجنون، شیریں فرہاد وغیرہ مشہور
 کہانیوں کا سہارا لیا ہے اور وارداتِ محبت کے اظہار کے لئے ساقی، شراب جام و مینا
 وغیرہ کا ذکر کیا ہے آسی کے کلام میں بھی ان سب چیزوں کا استعمال ملتا ہے گویا وہ
 اپنے قدیم صوفی شعراء کے پیرو کار ہیں آسی کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل سرد ہے خاک گرم جوشی ہوگی
 میخوار رہے نہ مئے فروشی ہوگی

امید شراب ناب کسی آسی
دور آخر ہے درد نوشی ہوگی

سمجھتے ہو جوش انا الحق کی موجیں
وہ قطرہ نہیں ہے جو دریا نہیں ہے

وہ دل کیا جو دلبر کی صورت نہ پکڑے
وہ مجبوں نہیں ہے جو لیلیٰ نہیں ہے

آسی صاحب ایک صاحب حال اور صوفی بزرگ تھے اسی لئے ان کے حال میں قال
کامزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف، ان کی اس کیفیت سے ہر ایک
لطف اندوز ہوتا ہے جیسے

حشر میں منہ پھر کر کہنا کسی کا ہاتے ہاتے

آسی گستاخ کا ہر جرم نا بخشندہ ہے

اس شعر میں حشر، اور اپنی گہنگاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے لیکن شعر کو جو
چیز اسی قبیل کے اور سینکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت یا
تمثیلیت ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس
رکھا ہے شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ بنا دیا ہے۔

آسی فرسودہ سے فرسودہ الفاظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں
اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لئے بالکل نیا ہو جاتا
ہے بطور مثال ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

غنجے ! تجھے میری دل فگاری کی قسم

شببم ! تجھے میری اشک باری کی قسم

کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی
 بے تاب ہے دل جناب باری کی قسم
 ”جناب باری“ عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسی نے نئی معنوی کیفیت
 سے بھر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں یہ قسم نہ کھاتی گئی ہوتی تو شاعر اس
 حالت کو پوری طرح بیان کر سکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے۔۔۔۔

آسی صاحب عاشق رسول ہیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری الفت و
 محبت ہے اس الفت و محبت کو ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنی شاعری میں جدت،
 دلکشی اور انکساری پیدا کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ان سے لگاؤ
 کا ذکر تینوں زبانوں عربی، فارسی اور اردو میں ملا کر پیش کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے
 بطور مثال مخمس کے ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں یہ مخمس مولانا جامی کی مشہور زمانہ نعت
 دلم زندہ شد از وصال محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تفسیمین ہے۔ (ادارہ) ۷

محال خرد ہے مثال محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر عرش تک پاتمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 یہ پھیلا ہے نور کمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں روشن است از جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دلم تازہ گشت از وصال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

متاع نظر ہے وہ روتے دل آرا انہیں کا دل ناتواں کو سہارا
 مری آنکھیں ہوں اور ان کا نظارا خوشا چشم کو بنگرد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم را

خوشادل کہ دارد خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

عبث درد عصیاں سے کیوں کرا ہے شفا اس مرض سے اگر اپنی چاہے
 تو لازم ہے ذکر نبی میں میں نبا ہے خوشا منزل و مسجد خانقا ہے

کہ دردے بود قبیل و قال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بد حش کلام خدا گشت نازل بہ اخبار قرشِ دنی گشت نازل
چو طہ و لیس بسا گشت نازل بوصف رخس و الفصحی گشت نازل

چو واللہ لیل شد زلف و خال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

روئے صفاخیز وہ زلف وہ تل ثنا سنج جن کا ہو ارب عادل
یہ ممکن نہیں وصف ان کے ہوں اے دل بوصف رخس و الفصحی گشت نازل

چو واللہ لیل شد زلف و خال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

وہی نور ہے اصل ارکان عالم انہیں نے بڑھائی ہے سب شان عالم
وہی جسم اظہر ہوا جانِ عالم بروے زمیں گشت سلطان عالم

کے کو بود پاتمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی عیش دنیا کی حسرت نکالے کسی کو پڑیں باغِ جنت کے لالے
کوئی شمع رویوں ہی سے لو لگالے بود در جہاں ہر کے را خیالے

مرا از ہمہ خوش خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خدا ہی مری حسرت دل نکالے کہیں محو روئے محمد اٹھالے
دل زار کو وقت آخر سنبجالے بود در جہاں ہر کے را خیالے

مرا از ہمہ خوش خیال محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہے فخر جہاں آسی ان کے غلامی اسی میں کمالات کی ہے تہائی
نہیں رہتی ہے پختہ کاروں میں خامی بصدق و صفائے خیال گشت جامی

غلامِ غلامانِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آسی کا یہ آخری محسوس علامہ اقبال کے اس شعر کے مترادف ہے ۔
 کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
 یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
 آسی کا یہ شعر بھی کتنا لکش و پر لطف ہے جو ان کے ماتے والوں میں شہرت
 سل کر چکا ہے ۔

عجب حسرت سے آسی کہہ رہا تھا کل مدینہ میں
 شفاعت ہوگی پہلے حشر میں یا ^{مصطفیٰ} صلی اللہ علیہ وسلم کس کی
 آسی صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا مقام یہ ہے کہ وہ مرنے
 کے بعد بھی روز جزا رسول کا نام لینا چاہتے ہیں وہ صرف ان کو ہی پکارنا چاہتے ہیں وہ
 رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن پاک سے لپٹ جانے کی تمنا کرتے ہیں مثلاً آسی
 کہتے ہیں ۔

وہاں بھی یہی نعرہ مارا کروں
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پکارا کروں
 قیامت کے دن جب اٹھوں خاک سے
 لپٹ جاؤں میں دامن پاک سے
 نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ سے ڈر
 رہے آپ کا جلوہ پیش نظر
 تمنا نہیں دل میں اس کے سوا
 علیک الصلوٰۃ اے نبی الوری
 آسی کا مندرجہ ذیل شعر، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے، کچھ لوگوں
 کے اعتراض کا سبب بنا رہا ۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر

اتر پڑا ہے مدینہ میں ^{مصطفیٰ} ہو کر

اس میں اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ خدا کو مجسم بتایا گیا ہے جو سر اسر کفر و شرک ہے لیکن یہ معترضین کی غلط فہمی ہے کیوں کہ اس شعر میں "مستوی عرش ہے" کا جملہ ہے نہ "مستوی عرش تھا" ہے۔ اگر مستوی عرش تھا ہوتا تو اعتراض بجا ہوتا چنانچہ مولانا شاہد علی عظیمی قدس سرہ، (سابق سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جون پور) تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت (آسی) کا ایک مطلع ہے جس پر کم علم مولویوں نے

کفر اور شرک کا فتویٰ دینے سے دریغ نہیں کیا۔ حضرت نے

جب یہ غزل کہی تھی میں خدمت میں حاضر تھا مطلع یہ ہے۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر

اتر پڑا ہے مدینہ میں ^{مصطفیٰ} ہو کر

جب یہ مطلع فرمایا تو میری طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ میاں

شاہد! جہلا اس شعر پر اعتراض کریں گے مگر ان کے اعتراض کا

جواب مصرعہ اول میں موجود ہے یعنی وہ اب بھی مستوی علی

العرش ہے افسوس کہ اگر معترضین حضرت شیخ اکبر رضی اللہ تعالیٰ

عنه کی فصوص الحکم وغیرہ دیکھے ہوتے تو اس گستاخی کی جرأت نہ

ہوتی اگر مصرعہ اولیٰ میں "وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر" ہوتا

تو البتہ ان کا اعتراض خدا کے مجسم ہونے کا صحیح ہوتا، وہ تو اب بھی

مستوی علی العرش ہے۔ مدینہ میں اترنا باعتبار نزول صفات کے ہے

جیسے آفتاب آئینہ میں اترتا ہے الان ما کان"۔ ۲۸

آسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سلام نبی پیش کئے ہیں ان کا یہ

سلام ۷

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد
بہت ہی مشہور ہے اس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر صاحب لکھتے ہیں:-

”اس سفر (سلسلہ مقدمہ کراچی) میں رات کے طول طویل
گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیئے اور آسی

غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر و رد زبان رہا ۷

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد“ ۲۹

آسی صاحب کے سلام کے چند اشعار یہ ہیں ۷

نسلام خدائے زمین و زماں

نثار سر سید مر سلاں

سلام مسلسل چو زلف میری

نثار سر چتر پیغمبری

سلام صفا خیز آب حیات

فداے جناب شہ کائنات

سلام اے دوائے دل درد مند

سلام اے میچائے دل خستگان

سلام اے گل گلشن اصطفیٰ

سلام اے نسیم بہار صفا

سلام اے سفر کردہ - لا مکاں

سلام اے مکین دل عاشقان

سلام اے مرے غم کے تم غم گسار

سلام اے گنہ گار امت کے یار

آسی کے تصوف نے درد کی طرح غزل کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ شاد عظیم آبادی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے درد کے نظریہ کو ہی اپنا یا ٹھیک اسی طرح آسی نے بھی اپنا کلام صوفیانہ انداز میں پیش کیا، فراق گورکھ پوری کے بقول:-

”شاد کے شعر درد میں ڈوبے دکھائی پڑتے ہیں تو حضرت آسی

پریم کی مستی میں نعرے مارتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔“

آسی کی غزل گوئی کی اہمیت اس سے بھی لگائی جاسکتی ہے کہ آسی کے شاگرد عبدالصمد نے جب اپنے استاد کی غزل غالب کو سنائی تو غالب سنتے ہی رہ گئے غالب نے ان کی غزل کی تعریف کی۔ آسی غالب کی شاعری سے بے حد متاثر تھے اسی لئے انہوں نے غالب کے مطلع پر مطلع کہا ہے۔

غالب کا مطلع ہے۔

سادگی پر اس کی مرجانے کی حسرت دل میں ہے

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

اسی پر آسی کا مطلع یہ ہے۔

وائے محرومی یہاں شوق شہادت دل میں ہے

جوش آب زندگانی خنجر قاتل میں ہے

غالب کا مطلع ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
اس پر آسی کا مطلع یہ ہے۔
قطرہ وہی کہ روکش دریا کہیں جسے
یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے
آسی نے مومن کی غزل پر بھی ایک غزل کہی ہے وہ یہ ہے۔

مومن ہے
آنکھیں جو ڈھونڈتی تھیں ننگے پائے التفات
کم ہو یا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
آسی نے اس مضمون کو اس پیرایہ میں ادا کیا ہے۔
بیانہ - نگاہ سے آخر چھلک گیا
سر جوش ذوق وصل تمنا کہیں جسے

اگر ان کے دیوان کا کچھ حصہ تلف نہ ہوا ہوتا تو بہت سی اس طرح کی غزلیں
دستیاب ہوتیں آسی کے کلام کا مجموعہ جو میر کے چھ دیوان سے بھی زائد تھا دیوان
(صوبہ بہار) میں تلف ہو گیا وہ بہت پہلے کا کلام تھا۔ پہلے کا کچھ ہی کلام دستیاب
ہو سکا۔ باقی کلام کا مجموعہ دیوان آسی مسمیٰ بہ "عین المعارف" ہے جو پاکستان،
کراچی سے بھی شائع ہو چکا ہے ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں غزل، مخمس،
مثلیت، سلام، قصیدہ، قطعہ تاریخ اور رباعی ہیں۔

آسی نے غزل، رباعی اور مثلیت کے علاوہ کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی
دو قصیدے کہے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والی رام پور کی شان میں
ہے اور مکمل ہے دوسرا میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ہے جو نا تمام ہے

ان قصیدوں میں فنی اعتبار سے کوئی بات قابل لحاظ نہیں ہے البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں مثلاً نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور کی شان میں قصیدہ کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کہاں ترا کوئی بحر و جود میں ثانی
 حباب دیدہ اہل نظر میں ہے پانی
 نہ فرق سوچھے اگر ظاہر و مظاہر ہیں
 کے کہے کوئی باقی کے کہے فانی
 اسی کو دیکھتے ہیں جمع بلکہ جمع الجمع
 بے سمجھتے رہے مدتوں پریشانی
 ہوا جو رفع تعین تو جز بہار نہ تھا
 یہ برگ و بار و گل و غنچہ گلستانی
 کہے بہار لب گل سے "میں بہار" تو کیا
 یہ شور کشن منصور وائے نادانی

درخت پھل سے ہے پیدا تو ہے درخت میں پھل
 یہ میری تیری ہے پیدائی اور پہنائی
 اگر یہ ہم ہیں تو کیا تیری ذات ہے محدود
 اگر یہ تو ہے تو کیا پھر وجود امکانی
 اگر یہی ہے تو وہ شوق دید کس کا تھا
 جواب تند سے کی کس نے شعلہ افشانی
 محل نہ جب ہوئی وحدت میں کثرت عالم
 تو کیوں شریک قدم ہو ثبوت اعیانی

زوال صورت اشیاء ہے صورت ہمہ اوست
 غرض کہ پہچانی ہوئی ہمہ دانی
 مال سعی نگاہ کمال تحقیقات
 نہ خاک کچھ نظر آیا بغیر حیرانی
 اخیر یہ کہ نہ پہچانتے کے قالب میں
 وہ ذات پاک گئی آشنا سے پہچانی
 مجھے امید سکون و قرار کیا اس سے
 جو اپنے جلووں کو رکھتا ہو آنی و فانی
 ابھی تو وجد میں لاتا ہوں عقل اول کو
 وہ چھیرتا ہوں میں آہنگ مطلع ثانی
 ز ہے طراوش جوش شہیون احسانی
 ظہور خاص کو خوش آئی وضع انسانی
 حباب گنبد گردوں میں یہ اشارہ ہے
 ہوا کی طرح ہے آنا ترا یہاں آنی

آسی کے مثلث شاعری بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مثلث بردوہہ ہندی یعنی
 ہندی دو ہے پر مثلث کو دہیان میں رکھ کر، آسی نے ان کی تخلیق بھی کی ہے۔
 مثلث اردو و ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ایک بند میں تین مصرعے ہوتے
 ہیں ان تینوں مصرعوں کے آپسی تعلق کی بنیاد پر اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں کسبھی
 تینوں مصرعے ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہوتے ہیں تو کسبھی پہلے دو مصرعے ایک
 ردیف اور ایک قافیہ میں اور تیسرا مصرع الگ ہوتا ہے لیکن مثلث کے سبھی بندوں
 کے تیسرے مصرعے ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہوتے ہیں۔ آسی کے بند مثلث

کے دو مصرعے ایک ردیف اور قافیے میں لکھے گئے ہیں اور ہر بند کا تیسرا مصرع ایک ایک ردیف اور قافیہ میں لکھا گیا ہے۔

آسی کے مثلث کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر بند کے دو مصرعے ہندی دو ہے پر لکھے گئے ہیں اور ہر بند کا تیسرا مصرع اردو زبان میں لکھا گیا ہے ان مصرعوں کی زبان اودھی ہے چونکہ آسی کا تعلق جون پور سے تھا اس لئے ان پر بھی جون پور کے آس پاس کی اودھی زبان کا اثر ہے مثلاً یہ مثلث ملاحظہ ہو۔

ماں راکھوں من جرے کہوں تو مکھو جر جائے

گونگے کا سپنا بھو سمجھو سمجھو پیچھتائے

مقام گو گو ہے سوزش غم جی جلائی ہے

ہم تم سہمی ایک ہیں کہن سنن کو دوے

من کو من سے تولے دو من کسجی نہ ہوے

ملا جب دل سے دل پیارے دوئی پھر کب سما

کاجر دوں تو کر کرائے سرما دیا نہ جائے

جن نینن ماں پیو بسیں دو جا کون سماے

پری جی ہو تو نظروں میں ہماری کب ساتی

نین رکت پاتی لکھوں جو بس ہوتے پیار

اچھر بن کاگد چڑھوں دیکھوں داس تہار

عجب خون جگر یہ بے بسی ہم کو کتلاتی ہے

میں چاہوں کہ اڑملوں اور پر بن اڑانہ جائے

کا کہوں کرتا رکو جو پرنا دیا لگائے

کوئی تدبیر ملنے کی نہیں ہم سے بن آتی ہے

آسی کی یہ نئی طرز تخلیق ہندی دو ہے پر اردو کا ایک مصرع جوڑ کر مثلث کی ایجاد ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے فرق کو مٹانے کے لئے ایک بے مثال قدم ہے اس طرز کے ذریعہ دونوں زبانوں میں ایک ایسا تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے جس کی آج ہمارے ملک اور معاشرے کو ضرورت ہے۔

آسی نے فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بڑے عمدہ شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری کے علاوہ ان کی نثری خدمات بھی ہیں۔ ان کے تین رسالوں کے علاوہ کوئی مزید دیگر نثری تصنیف کا پتہ نہیں چلتا وہ تین رسالے یہ ہیں (۱) سراج الصراف جو فن صرف میں ہے (۲) فوائد صدیقیہ جو فن نحو میں ہے (۳) فوائد جوہر یہ جو فن منطق میں ہے۔ ان رسالوں کے علاوہ آسی نے بہت سے حاشیے اور شرحیں بھی لکھی ہیں جو غیہ مشبوہ اور نایاب ہیں۔

اردو زبان میں آسی کی خطوط نگاری کے نمونے ہی ملتے ہیں جن کا اردو ادبی خدمات میں شامل کیا جانا بے جا نہ ہو گا۔ ان کے خطوط میں مرزا غالب کی طرز تحریر اور ان کا رنگ و آہنگ ہے کیوں کہ آسی نے غالب کا زمانہ پایا تو ان کی طرز تحریر سے متاثر ہوتے جس کی جھلک آسی کے اس خط سے ملتی ہے جس میں اپنی نواسی عزت بی بی عرف بہنی صاحبہ کے نام لکھتے ہیں:-

”عزت بی بی

بسمہ و حمد، نور بصر مد عمرہ

آج مشکل ہے۔ سینچر کے روز میں بہمن برہ میں آستانہ بوس خانقاہ و درگاہ ہوں، طبیعت جیسی غازی پور میں تھی ویسی ہی ہے، بہمن برہ میں تمہارا خط پایا، اس کے قبل دس روپیہ سکندر پور سے میں بھیج چکا تھا، مولوی رفیع اللہ کے ذریعہ سے تم کو مل گیا ہو گا دس روپیہ آج بھیجتا ہوں اس میں سے پانچ روپیہ تم لے لینا اور پانچ روپیہ

سید حسین کے دو اعلاج کے واسطے اپنی نانی کو دے دینا اور کہہ دینا کہ دوسرے خرچ میں خرچ نہ کریں۔ سب کو میری دعا کہنا۔ اس وقت زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔

محمد عبدالعلیم

بروزہ شنبہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ۔

آسی کے اور بھی کئی خطوط ہیں جن سے ان کی خطوط نگاری پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ آخری لمحہ تک اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ۲ جمادی الاول، ۱۳۳۵ھ اتوار کے دن انتقال کر گئے۔

<http://t.me/Tehqiqat>

(۵)

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکیش

مرتضیٰ احمد خاں نام تخلص میکیش تھا۔ ماہ محرم ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ والد ماجد کا نام مرید الدین احمد خاں تھا۔ مولانا میکیش کے اجداد میں سے جناب گل محمد، جن کا تعلق افغان قوم کے قبیلہ محمد زئی درانی سے تھا ۱۸۰۰ء میں افغانستان سے ہجرت کر کے جالندھر تشریف لائے ان کی اولاد نے علوم کی نشرو اشاعت میں بڑا اہم کردار نبھایا۔

مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکیش نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مرید احمد خاں سے حاصل کی اس کے بعد جالندھر کے اسکول میں پڑھتے رہے پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور کے کالج میں داخل ہوئے اور دو سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لئے کالج چھوڑ کر چلے گئے اور ایک سال کے بعد لاہور واپس آ گئے اور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف روزناموں میں ایڈیٹر کی

حیثیت سے کام کیا اور ملک کی علمی و ادبی تحریکوں کے علاوہ آزادی کی جنگ میں بھی حصہ لیا اور صعوبتیں برداشت کیں۔ اور عمر کے آخری ایام بڑی تنگی اور پریشانی میں گزارے مگر عزم و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھٹا مظہر الدین نے ان کی مستقل مزاجی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

”مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکیش نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک دن میں اپنی زندگی کی ناہمواریوں سے تنگ آکر پریشان بیٹھا تھا کہ خضر آئے اور مجھے تسکین دے کر چلے گئے۔“ ۳۱

مولانا میکیش مایہ ناز صحافی، بلند پایہ ادیب، ملت اسلامیہ کے بے باک ترجمان اور تحریک آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ جمعیتہ العلماء (پاکستان) کے مشیر قانونی اور قائد تحریک ختم نبوت مولانا ابوالحسنات قادری کے رفیق خاص تھے۔ ۱۹۴۰ء میں شہر بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد ہوئی تو مولانا ابوالحسنات میکیش کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے جہاں وہ خصوصی اجلاس میں شریک ہوئے اور کچھ قراردادیں بھی پیش کیں جو اتفاق رائے سے منظور ہو گئی تھیں۔

تصنیف و تالیف = مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکیش نے اردو، فارسی دونوں میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا اور اہم کتابیں تصنیف کیں۔ جب کابل سے لاہور واپس آئے تو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف روزناموں میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ہفت روزہ افغانستان (جو فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا) میں انگریزی استعمار کے خلاف مقالے لکھے جس کی بنا پر ۱۹۳۱ء میں ایک سال تک جیل میں رہے لیکن جب جیل سے واپس ہوئے تو پھر ان کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں اور ان کی ادبی و سیاسی دلچسپی میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہوں نے لاہور سے نکلنے والے روزناموں مثلاً

زمیندار، احسان، شہباز، مغربی پاکستان اور نوائے پاکستان میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا اور غیر مالک سنگاپور، ملایا اور برما وغیرہ کاتن تنہا سفر کیا۔ ان بے باک صحافی کے قلم کی تعریف کرتے ہوئے شیخ اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:-

”اپنے زمانے میں لاہور کی صحافت میں ان کا طوطی بولتا تھا“۔ ۳۲

اس کے علاوہ انہوں نے اردو زبان و ادب کی گرانقدر خدمت اپنی تصنیفات سے

کی ہے ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:-

- ۱۔۔۔۔۔ الہامی افسانے، اردو زبان میں قرآنی واقعات کی روشنی میں یہ افسانے لکھے گئے ہیں (مطبوعہ لاہور)
- ۲۔۔۔۔۔ ابرز شکن گرز عرف مرزائی نامہ (فارسی)
- ۳۔۔۔۔۔ اخراج اسلام از ہند (فارسی)
- ۴۔۔۔۔۔ تقدیر و تدبیر (اردو)
- ۵۔۔۔۔۔ تاریخ اقوام عالم دو جلد (اردو)
- ۶۔۔۔۔۔ تاریخ اسلام چار جلد (اردو)
- ۷۔۔۔۔۔ اسلام اور معاشی حالات (اردو)
- ۸۔۔۔۔۔ دو دلدل مطبوعہ (مجموعہ کلام اردو)
- ۹۔۔۔۔۔ مجموعہ کلام فارسی (غیر مطبوعہ)

اردو زبان میں ان کی ایک اہم نثری کتاب ”الہامی افسانے“ ہے یہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہے اس کا نمبر دسنہ ۷۳۱۴ ہے یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ یہ افسانے قرآنی واقعات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مولانا میکیش کا اسلوب نگارش مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب سے بہت قریب ہے۔ مولانا آزاد نے جس طرح گراں بار الفاظ کا استعمال کیا ہے اسی طرح

میکش نے بھی کیا ہے غرض دونوں کی تحریریں ملتی جلتی ہیں۔ ان کی ماوری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے ان کی تصانیف میں فارسی رنگ غالب ہے ذیل میں میکش صاحب کی کتاب ”اہامی افسانے“ سے نمونہ کے طور پر ایک عبارت نقل کرتا ہوں جس سے ان کے طرز تحریر کا انداز ہو گا۔

”آج سے ہزار ہا سال پیشتر ریگستان عرب کے بادیہ نشین نے عالم رویا میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے لخت جگر کے گلے پر چھری پھیر رہا ہے وہ خدا کا ایک مقبول و برگزیدہ بندہ تھا۔ اس نے خیال کیا کہ میرا پروردگار اپنے بندے سے کسی قربانی کا طلبگار ہے چنانچہ اس نے صبح اٹھ کر اونٹوں کا ایک گلہ ذبح کیا۔ اور گوشت مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔

دوسری رات پھر اس نے عالم خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے مالک حقیقی کی قربانگاہ پر اپنے اکلوتے دل بند کو لے کھڑا ہے۔ اس کے خواب ہمیشہ سچے ہوا کرتے تھے۔ اس نے خیال کیا کہ میرا مولا مجھ سے مزید قربانیوں کا طالب ہے اس لئے صبح اٹھ کر اس نے اونٹوں کا ایک اور گلہ ذبح کر ڈالا اور گوشت بھوکے مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔

تیسری شب پھر اس نے عالم رویا میں یہی ماجرا دیکھا اور اپنے پروردگار کی آواز سنی کہ ہم تیرے بیٹے اسماعیل کی قربانی چاہتے ہیں خدا کا یہ برگزیدہ بندہ اس آواز کو سنتے ہی بستر سے اٹھ بیٹھا اور سب سے پہلے اس نے اپنے مولا کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا اور گزشتہ دو دن کی اجتہادی لغزش پر معافی مانگی۔

صبح ہوئی تو اس نے اونٹوں، بھیرٹوں اور بکریوں کے گلوں سے منہ موڑ لیا اور اپنے دلہند سے مخاطب ہو کر کہا کہ میرے مولا نے تمہیں اپنے پاس بلایا ہے اور میں تمہیں اللہ کی راہ میں قربان کرنے والا ہوں۔

نئے بچے کو اپنے پروردگار اور اپنے باپ کی دوستی کا علم تھا وہ اس بلا سے پر بہت خوش ہوا اس کے رخسار خدا کی راہ میں قربان ہونے کی خوشی سے تھمتاٹھے۔

خدا کے اس برگزیدہ بندے کی سعادت مند بیوی کو بھی اپنے شوہر اور اپنے خدا سے دوستانہ رشتہ کا علم تھا جب اس نے باپ اور بیٹے کی اس خوشی کا ماجرا سنا تو وہ بھی بانی کی یہ نئی عید منانے میں ان کے شریک ہو گئی۔

صحرا نشینوں کے گھر عید منائی جانے لگی اور شوہر بیوی اور ان کا اکوٹا بیٹا تینوں اس زالی قربانی کے لئے اپنی اپنی جگہ پر طیاری کرنے لگے۔" ۳۳

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکیش نثر نگاری کے علاوہ شعر و ادب سے بھی ذوق رکھتے وہ ایک قادر الکلام فطری شاعر تھے اردو میں ان کا مجموعہ کلام مطبوعہ ہے جس کا "دودل" ہے۔

ان کی ان اردو خدمات کی بدولت انہیں اردو کا ممتاز صحافی، معروف ادیب و سرکہنا بے جا نہ ہو گا۔ انہوں نے اردو کے سرمائے میں گرانقدر اضافے کیے ہیں۔ آخر کار مولانا مرتضیٰ احمد خان میکیش ۲۷ جولائی (۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء) کو تے فانی سے کوچ کر گئے۔

(۶)

مولانا سید محمد سید کچھو چھوی

نام سید محمد، تخلص سید تھا۔ ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء۔ چہار شنبہ کے دن نماز فجر سے پہلے قصبہ جاتس ضلع راتے بریلی (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید نذر اشرف تھے۔ والدہ ماجدہ سیدہ محمدی خاتون بنت اعلیٰ حضرت اشرفی میاں تھیں۔ سید صاحب اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور ان کی دو بہنیں تھیں۔

(۱) سیدہ احمدی خاتون (۲) محترمہ سیدہ صاحبہ۔

مولانا سید محمد سید کے ابا و اجداد ملک ایران سے ہندوستان آئے تھے جس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ حسینی سادات کا ایک قبیلہ ملک سمنان جو اس وقت ایران کے دار السلطنت تہران کے قریب واقع ہے، کے تخت و تاج کا مالک تھا سیادت و قیادت وراثت میں ملی تھی اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی (متولد ۷۰۸ھ) قدس سرہ تھے انہیں ۷۲۳ھ میں ملک سمنان کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ دس سال تک حکومت کرنے کے بعد اپنی پچیس سالہ عمر ہی میں تخت و تاج کو ٹھوکر ماردی اور روحانیت سے محروم انسانیت کی فلاح و اصلاح کے لیے اپنے وطن کو خیر آباد کہا اور پھر مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے یہاں کچھوچھو، فیض آباد میں بودوباش اختیار کر لی۔ سو سالہ زندگی میں شاہ سمنان کو جہانگیر، محبوب یزدانی، غوث العالم، اوحہ الدین، تارک السلطنت جیسے القابات سے نوازا گیا۔ حضرت شاہ علاء الحق پنڈوی جیسے معظم شخص سے شرف بیعت و ارادت حاصل ہوئی۔ حضرت خواجہ بندہ گیو دراز، حضرت مخدوم شاہ مینا، حضرت شیخ علاء

مولانا سمٹانی، حضرت خواجہ حافظ شیرازی، حضرت خواجہ بہار الدین نقشبند، حضرت
 عبد اللہ یافعی، حضرت سید جلال بخاری وغیرہ جیسے علما و صوفیاء۔ مخدوم سمٹانی
 اشرف جہانگیر سمٹانی کے معاصرین میں سے تھے۔ سلطان سید اشرف جہانگیر کی
 موت سے منسوب "خاندان اشرفیہ" کے پہلے فرزند کی حیثیت سے حضرت نور العین کا
 نام آتا ہے اور پھر یہیں سے سادات حسینی کے اس قبیلے کو سادات اشرفیہ کے نام
 سے پہچانا جانے لگا۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ مولانا سید محمد سید کچھوچھوی ہیں۔
 مولانا سید محمد سید کے دادا شاہ سید فضل حسین اشرف نے ان کو بسم اللہ پڑھائی
 کی والدہ نے چھ ماہ میں پارہ۔ عم یعنی قرآن مجید کا تیواں پارہ ختم کرایا اور پھر
 بیس دن میں باقی ۲۹ پارے پوری روانی کے ساتھ ختم کروائے۔ ابتدائی تعلیم والد کی
 مدد میں مکمل کی اس وقت مروجہ فارسی کی تمام متداول کتابیں پڑھیں۔ اعلیٰ تعلیم
 کے لئے مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ میں داخل ہوئے اور فضیلت کی ڈگری حاصل
 کی۔ لکھنؤ سے علی گڑھ آکر مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے منطق و فلسفہ کی ادق اور
 اہم کتابیں پڑھیں۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے ان کو سند فراغت میں "علامہ"
 تحریر کیا۔ اس کے بعد پہلی بھیت گئے اور مولانا وصی احمد محدث سورتی سے صحاح
 ستہ، مؤطا، معانی الآثار وغیرہ حدیث کی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا اور سند حدیث حاصل
 کی پھر بریلی (یوپی) آئے اور مولانا احمد رضا خان بریلوی سے فتاویٰ نویسی کا فن
 حاصل کیا وہاں سے بدایوں گئے تو مولانا عبدالمقتر بدایونی سے سند حدیث ملی اس
 سنت و جانفشانی کے بعد مولانا سید محمد "محدث اعظم ہند" کے نام سے مشہور
 ہوئے۔

ان تمام علمی و تحقیقی منازل کو ستہ سال کی عمر میں عبور کر لیا اس کے بعد دہلی آئے اور مولانا سید محمد مہر کی سرپرستی میں مدرسۃ الحدیث قائم کیا اور کئی سال تک حدیث پڑھائی۔ قانون شیخ، رسالہ قشیرہ یہ جیسی کتابیں بھی ان کے زیرِ درس رہیں۔ تصوف و طب کی بھی تدریس جاری رکھی۔ تصنیف و تالیف سے بھی لگاؤ رہا اور اپنے مخالفین کی تحریک کی بیخ کنی کرتے رہے۔

مولانا سید محمد بیک وقت عالم، ادیب، خطیب، صوفی، شاعر، محدث اور پیہ طریقت تھے۔ پورے سال تبلیغی دوروں میں منہ و فہم رہتے پانچ ہزار سے زائد غیہ مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ سندھ و ہند، عرب و عجم کے علاقوں کا تبلیغی دورہ کیا اور لاکھوں گوراء ہدایت پر لگایا مولانا نے نہ صرف اپنی خطابت سے اسلام کی تبلیغ کی بلکہ تحریر کا بھی سہارا لیا چنانچہ کتابوں کی تصنیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں کچھوچھہ سے "اشرفی ماہنامہ" جاری کیا جو اردو زبان میں تھا اس کے ذریعہ انہوں نے دین اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

مولانا سید محمد صاحب نے اپریل ۱۹۴۶ء میں بنارس میں ایک عظیم الشان سٹی کانفرنس کرانے کے لئے کلیدی رول ادا کیا۔ وہ اس کے صدر رہے۔ بنارس کانفرنس کے خطبہ۔ صدارت میں مولانا نے فرمایا:-

"ہم وہ دن دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر فرد مبلغ ہو، ہماری پرانی تاریخ یہی تو تھی کہ بادشاہ مبلغ، رعایا مبلغ، پیر مبلغ، مرید مبلغ، سوداگر مبلغ، مزدور مبلغ۔ کوئی مثال ہے کہ صحابہ کرام سے دولت ایمان پانے والا مبلغ نہ ہو، تبلیغ تو اسلام کا اصل سرمایہ ہے یہ جملہ خطبات آل انڈیا سٹی کانفرنس سے دوبارہ دیکھا جائے؟ یہ ہودیت نے سازش کے سوا کیا دیکھا تھا۔ نصرانیت

کامنتہ ” دو کا ایک اور ایک کا تیسرا والا کان کے مو میدان میں
کہنے والا کب تھا۔ “

مولانا سید محمد سید صاحب کو دین متین سے گہری الفت و محبت تھی۔ جس کا اندازہ اس خطبہ - صدارت سے لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کے لئے جو ایکٹ بنائے گئے اس کے منہ اثرات پر مولانا کی نگاہ پہنچی اور انہوں نے اس وقت کتل کر مطالبہ کیا کہ حکومت مسلمانوں کے عائلی قوانین اور شرعی امور کے تصفیہ کے لئے اسلامی ” دارالقضاة “ بنائے۔

وہ سیاسی امور میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن ان کے نزدیک اس سیاست کی اہمیت تھی جس میں مذہب و اصول کا دخل ہو۔ آزادی کی تحریک ہو کہ خلافت کی تحریک، شدت کی تحریک ہو کہ قادیانی فتنہ، محاذ پر مولانا سید نے اپنے ثبات قدم کا مظاہرہ کیا۔ حکومت برطانیہ نے جب کبھی کسی ملک و ملت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو مولانا نے سخت الفاظ میں اس کی مذمت کی۔ مولانا کی سیاسی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ شدت کی تحریک کے پس پردہ ہندوستان کو جارت ہندو فرقہ پرستوں کے زہم و کرم پر چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں ہے یہ جتنے بھی فتنے برطانوی اور سامراجی قوتوں نے ہندوستان میں اٹھائے تھے سب کی کڑی ” برسنگم پیلس “ ہی سے جا کر ملتی تھیں لہذا انہوں نے مسلمانوں کو اس کے فتنے سے آگاہ کیا اور اپنے میگزین ” ماہنامہ اشرفی “ کے ذریعہ تمام فتنوں اور مشنوں کی دھجیاں اڑادیں ملک کے طول و عرض کے دورے کر کے لوگوں کے دلوں میں علم کا چراغ روشن کیا۔ سید صاحب آل انڈیا سنی کانفرنس، جماعت رضائے مصطفیٰ اور، الجمعیتہ الاشرفیہ کے تاحیات صدر رہے۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کی سماجی، اقتصادی، تعلیمی، دینی اور سیاسی امور میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

سید صاحب کو اپنے ملک ہندوستان سے بے حد پیار تھا چنانچہ تقسیم ہند کے بعد

۱۹۵۳ء میں پاکستان کے سب سے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے بذات خود ایک خط لکھ کر مولانا سید محمد سید کو پاکستان کے آئین ساز ادارے کی چیئرمین شپ کی پیشکش کی تھی اور مستقلاً پاکستان میں رہنے کی گزارش کی تھی مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا:-

” آئین ساز ادارہ کی صدارت کی پیشکش کا شکریہ، فقیر کے لئے ہندوستان میں قیام، ملت اسلامیہ کے لئے از حد ضروری ہے خواجہ ہند کے ہندوستان کو میں نہیں چھوڑ سکتا فقیر سائنڈ نہیں ہے۔ نتھا ہوانیل ہے اس کے ایک کھوتھو ہے اور وہ ہے سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا دربار پاک۔“ ۴۴

تصنیف و تالیف

مولانا سید محمد نے تبلیغی دوروں میں کافی مصروفیت کے باوجود تصنیف و تالیف جیسا مشکل کام بھی انجام دیا ہے۔ سخت پابند مذہب ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں مذہبی رنگ چھایا ہوا ہے اسی لئے افسانے اور کہانیوں کی طرف رجحان نہیں ہوا۔ انہوں نے ۱۹۲۲ء میں کچھوچھو سے ”ماہنامہ اشرفی“ اردو زبان میں جاری کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو زبان میں تقریباً ۳۵۵ مدلل و مبسوط رسائل اور کتابیں لکھ کر شائع کیں اور ان کی بہت ساری مزید تصنیفات شائع نہ ہو سکیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں چند اہم تصانیف یہ ہیں:-

- (۱) ترجمہ - قرآن مجید (اردو) مطبوعہ
- (۲) حیات غوث العالم (سوانح سید اشرف جہانگیر سمنانی) مطبوعہ، (اردو)
- (۳) اتمام حجت، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۵ء - (اردو)

- (۴) تقوی القلوب، مطبوعہ کان پور ۱۹۲۵ء (اردو)
- (۵) قرآن مجید کی تفسیر (تین پارے اور چند رکوع کی تفسیر لکھی تھی کہ وفات ہو گئی)، (اردو)
- (۶) فرش پر عرش (مجموعہ کلام، اردو) مطبوعہ
- ان کی تصنیفات میں ترجمہ قرآن مجید (اردو) اور فرش پر عرش (مجموعہ کلام اردو) بہت اہم اور اردو ادبی خدمات میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

ترجمہ قرآن مستحکم بہ معارف القرآن :-

یہ ترجمہ قرآن مجید ان کئی اہم ترجموں میں اپنا ایک مقام حاصل کر چکا ہے جو کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمہ کے علاوہ مولانا نے تفسیر قرآن بھی لکھی تھی مگر وہ مکمل نہ ہو سکی۔ مولانا سید محمد نے اپنی تفسیر میں شروع سے لے کر آخر تک اس بات کا خیال رکھا ہے کہ عام قاری اسے آسانی پڑھ سکیں اس کی زبان صاف ستھری اور سادہ زبان ہے لیکن اسے وہ شہرت نہ حاصل ہو سکی جو ترجمہ قرآن مجید کی ہوتی۔

قرآن مجید کے مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کئی علوم و فنون مثلاً، علم نحو، علم صرف، اصول تفسیر، علم فصاحت و بلاغت، اصول فقہ وغیرہ پر گہری نظر رکھتا ہو تب ہی اپنا فرض بخوبی نبھاسکے گا۔ مولانا سید محمد کی ان تمام علوم و فنون پر گہری نظر تھی اسی لئے ان کے تراجم قابل تحسین ہیں۔ مولانا نے ارشاد باری کے مطابق اردو ادب کے اسلوب بیان میں فنی محاسن کے ساتھ بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ عربی زبان

میں جو اسلوب بیان قرآن حکیم کا ہے اردو زبان میں وہی اسلوب بیان انہوں نے ہی اختیار کی ہے ان کا یہ ترجمہ بامحاورہ اور شستہ زبان میں ہے۔ ان کے ترجمہ قرآن کے ابتدائی حصہ کو دیکھ کر مولانا احمد رضا بریلوی نے کہا ”شہزادے! اردو میں قرآن لکھ رہے ہو۔“ یہ ترجمہ شائع ہو چکا ہے ان کا یہ ترجمہ گجراتی، ہندی اور لپٹی میں ہی ہے۔

اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے جسے ہر اردو کا پڑھنے والا بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کے الفاظ میں وہی ترتیب رکھی گئی ہے جو ترتیب الفاظ سورہ کی ہے اور ان کے ترجمہ میں ایک لفظ ہی زیادہ نہیں ہے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ترجمہ میں مشہور لفظ ”شروع کرنا ہوں“ ترک کر دیا ہے تاکہ جس طرح قرآن مجید میں اس جملے کے متعلق کوئی لفظ نہیں ہے ترجمہ میں بھی نہ لایا جائے۔

اس ترجمہ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ترکیب نحوی جو عربی زبان میں اصل الفاظ سورہ کی ہے وہی اردو زبان میں برقرار رکھی گئی ہے مثلاً ایاک نستعین کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے کہ گنجی سے ہم مدد چاہتے ہیں حالانکہ یہ ”یک نستعین“ کا ترجمہ ہے ایاک نستعین میں مفعول بہ واقع ہے جار مجرد نہیں اس لیے مولانا سید محمد نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ایاک نستعین کا یہ ترجمہ کیا ہے ”ہم تیری ہی مدد چاہیں“۔ تاکہ اردو میں بھی مفعول بہ کی ضمیر مقدم رہ کر حصر کا فائدہ پہنچائے اور ترکیب میں ادبی تغیر کا بھی وہم نہ ہو اس ترجمہ میں حتی الامکان عربی اور فارسی الفاظ سے اجتناب کیا گیا ہے اور آسان سے آسان ترین لفظ کو استعمال میں لایا گیا یہ مثلاً ”ینتر بصرن با نفسہن ثلثۃ قروء“ میں مولانا نے قروء کا ترجمہ بجائے حیض، ماہواری کے کیا ہے اسی طرح ”انار سلناک شاہدا“ میں شاہد کا ترجمہ بجائے حاضر ناظر کے ”چشم دید

گواہ ” اختیار کیا ہے اس کے علاوہ مثال کے طور پر چند آیتوں کے ترجمے پیش کئے جا رہے ہیں جن سے ان کی اردو ترجمہ نگاری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید :- ان الذین کفروا سوا علیہم ءانذرتہم ام لم تنذرہم لا یومنون (سورہ بقرہ) ترجمہ : ” بیشک جنہوں نے جنم کا کفر کمایا یکساں ہے ان پر کیا ڈرایا تم نے انہیں یا نہ ڈرایا انہیں وہ مانتے والے ہی نہیں۔ ” اس ترجمہ میں خوبی بیان کے ساتھ اردو محاورہ کی پوری رعایت کی گئی ہے بطور مثال جب کسی کی کذب کوئی شہرت پالیتی ہے تو اس کے بارے میں لوگ یہی کہتے ہیں کہ وہ جنم کا جھوٹا ہے ، گویا وہ کسبی سچ بولا ہی نہیں۔ اس آیت میں دراصل حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے جو علم الہی میں ایمان سے محروم ہیں یہ ابو . جہل ، ابولہب وغیرہ کفار کے حق میں نازل ہوئی۔

قرآن مجید :- ان اللہ علی کل شیء قذیرہ (سورہ بقرہ) ترجمہ : بیشک اللہ ہر چاہے پر قدرت والا ہے۔ اس ترجمہ میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے شئی کا معنی چیز لے کر کذب وغیرہ اللہ کی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ ان لوگوں نے شئی کا مفہوم ہی نہیں سمجھایا یہاں پر ہر چاہے سے شئی کا مفہوم واضح کر دیا گیا ہے کہ شئی اس کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ چاہے اور جسے نہ چاہے وہ شئی سے خارج ہے دوسرے لفظ میں شئی کا معنی جو تحت مشیت آسکے۔ تمام ممکنات شئی میں داخل ہیں کیوں کہ وہ تحت قدرت ہیں اور جو ممکن نہیں یعنی واجب یا ممتنع ہے اس سے قدرت و ارادہ متعلق نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات واجب ہیں اس لئے مقدور نہیں، اس ترجمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کذب اور تمام عیبیں محال ہیں اس قدرت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے مولانا جلال الدین سیوطی کی مشہور تصنیف ” تفسیر جلالین (جلد اول) ” میں شئی کی تفسیر شاعر ہے جو اس ترجمہ کی مکمل تائید کر رہی ہے

کیوں کہ شاعر کے معنی میں چابست کا معنی شامل ہے۔

قرآن مجید :- قل هو اللہ احدہ (سورہ اخلاص) ترجمہ : تم کہتے رہو کہ وہی اللہ ہی یکتا ہے، اس ترجمہ میں قل کا معنی تم کہتے رہو، دوام و استمرار کے طور پر ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ توحید میں کسبِ غنفلت نہیں اختیار فرمائی۔

لہذا اس کے اندر رسول کے مقام و منصب کو مد نظر رکھتے ہوئے قل کا معنی تم کہتے رہو کیا گیا ہے تاکہ بعد میں کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ رسول نے اعلانِ توحید میں کسبِ غنفلت سے کام لیا ہے غالباً اسی کی رعایت کرتے ہوئے قل کا معنی دوام و استمرار کے طور پر کیا گیا ہے۔ راقم السطور نے چند آیات کریمہ کے ترجمے معارف القرآن (مترجم مولانا سید محمد) سے نقل کر کے صفحہ قرطاس کے حوالے کر دیئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے کچھ نکات و معارف کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ واقعی معارف القرآن اردو زبان میں بے مثال ترجمہ قرآن ہے۔

شعر و ادب :-

مولانا سید محمد سید صاحب کو قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے دینی مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی شغف تھا۔ سید صاحب ایک فطری شاعر تھے۔ لیکن آپ نے نعتیہ شاعری میں کمال پیدا کیا۔ نعت جیسے مشکل مرحلہ سے گزر کر انہوں نے عشقِ رسول کا ثبوت دیا ہے ان کا تمام نعتیہ کلام رنگِ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے اور اسی رنگِ تغزل کو سید صاحب معراجِ شاعری سمجھتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

معراجِ شاعری ہے سید تغزل

سید صاحب ایک نازک خیال شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ ان کا دیوان "فرش پر عرش" دنیائے شعر و ادب میں اہمیت رکھتا ہے یہ دیوان ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جو ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں اقبال کا رنگ، کہیں غالب و میر کی جھلک کہیں محسن کا کوروی کا اسلوب، نعت و منسبت سے خصوصی لگاؤ نظر آتے گا۔ غزل و نظم پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔

سید صاحب کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف انداز تغزل بھی برقرار رہتا ہے تو دوسری طرف متنوع مضامین کی رنگارنگی بھی نہیں جاتی۔ جن کا کسی نہ کسی طرح سے کوئی تعلق نعت رسول سے ہی ہوتا ہے۔ سید صاحب نے تصوف سے لے کر عشق و خودی تک کے مضامین پر طبع آزمائی کی ہے جو ان کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور نقوش کی طرف نشاندہی کرتے ہیں مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ انداز اور لہجہ غزل کا ہی رہتا ہے مثلاً چند مضامین ایک ہی زمین کے تحت ملاحظہ کریں

خمریات ۷

ان سب نگاہوں نے وہ چیز پلائی ہے
جو تقویٰ کا تقویٰ ہے، مے نوشی کی مے نوشی

عشقیہ : ۷

تم شمع سے جی سیکھو پروانوں سے جی سیکھو
خاموشی میں گویائی، گویائی میں خاموشی

نعتیہ : ۷

محبوب کی فرقت میں یہ غم کی نشانی ہے
بے وجہ نہیں سید کعبہ کی سیاہ پوشی

سید صاحب کے متنوع مثنائین کے اشعار یہ ہیں ۔

نظریہ حسن و عشق : ۔

عشق کیا اور حسن کیا ہے
 جس کے دور میں شباب نہیں
 عشق کا آپ پر دعویٰ کیجئے
 پہلے پتھر کا کلیجہ نیچئے
 مقام عشق ہے قانون کی زد سے بہت بالا
 یہاں پر آنے والا عقل سے بیگانہ ہوتا

نظریہ خودی ۔

خود میں سارا سمٹ آیا ہے عالم تکوین
 مری سرشت میں مضمحل ہے راز کن فیکون
 نفس کو جس نے قتل کر ڈالا
 لقب اس کا شہید و غازی ہے
 ذوق عمل : ۔

دل میں رکھیے جستجوئے ذوق کو
 کون کہتا ہے نہ تقویٰ کیجئے

نظریہ موت ۔

جو باطل پرستوں کو غم ناک کر دے
 جو حق گوئی پر مجھ کو پیباک کر دے

گناہوں کے دفتر کو جو پاک کر دے
اسی موت کو زندگانی کہوں گا
نظریہ زندگی و بندگی: ۱۰

ورد سے جو بھری نہ ہو زندگی زندگی نہیں
حرص و بلا خصوص کی بندگی بندگی نہیں
حیات دوام کا نظریہ: ۱۱

میٹھا کی میٹھا دانوں کے داناں میں
حیات جاوداں کا راز ہے شمشیر عریاں میں
دنیا کی بے ثباتی: ۱۲

زندگی کا کوئی ثبات نہیں
مل گیا دن اگر تو رات نہیں
گردش صبح و شام: ۱۳

دن یاد رخ شہ میں گزرا پھر زلفوں میں دھیان رہا
یوں شام سے میری صبح ہوتی یوں صبح سے میں نے شام کیا
تاثیر چشم محبوبی: ۱۴

مرے نالے میں ہے نہ آہ میں ہے
جو اثر آپ کی نگاہ میں ہے
وہ مست اپنی نظر کا بنائے جاتے ہیں
پتے ہوتے ہیں مجھے جی پلائے جاتے ہیں

جلن کو دل کی رخ آتشیں سے بھڑکا کر
وہ آگ آگ کے اندر لگاتے جاتے ہیں

نعتیہ کلام کے علاوہ سید کے یہاں حمد خدائے تعالیٰ بھی جا بجا دکھائی دیتی ہے مگر
لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا انداز بھی غزل کا ہے علامہ اقبال کی وہ غزل جس کا

مطلع ہے
" کبھی اسے حقیقت منظر نظر آ بس مجاز میں "

ہے اس پر سید صاحب کا کلام اس طرح سے ہے

کسی رنگ و بو کی نہ جستجو نہ کسی لباس کی آرزو
میرا ذوق سجدہ ہے اور تو کہ مجاز پھر بھی مجاز ہے
تیری ہر ادا میں ہے سوز شیں، تیر ہر ادا میں ہے سازشیں
میں نثار عشوہ - یار کے وہی سوز ہے وہی ساز ہے

یہ اشعار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سید صاحب نہ صرف اپنے موضوع
سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں بلکہ فن کے تمام تقاضوں کے ساتھ بھی پورا
انصاف برتا ہے اور فن کی تمام باریکیوں کا مکمل خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید
شعر گوئی کے اس مسلک پر اصرار کرتے ہیں

شعر کہنے کا اگر حق ہے تو اس کو سید
جو سخنگو سے سخن سنج و سخنداں ہو جاتے

دراصل ان کی شاعری کا یہی تاہناک نظریہ۔ فن تھا جس سے ان کو شعر گوئی میں
کمال حاصل ہوا۔ اختصار کے بارے میں سید کا کلام ملاحظہ ہو

دل میں لہریں حسن کی بھر دیکھتے
بنداک کوزے میں دریا کیجئے

مذکورہ بالا تمام اشعار سے یہ پتا چلتا ہے کہ سید کے الفاظ کی نشست و برخاست میں چستی و روانی اور برجستگی موجود ہے اور کلام میں مضمون آفرینی اور جدت طرازی، نازک خیالی اور بلند پروازی، فکر و معانی کی گہرائی و گیرائی، لطیف بزلہ سنجی اور جذبات و کیفیات کا پیچ و خم، تازگی اور شگفتگی، نغمگی اور موسیقیت، موزونیت اور شیرینی سب کچھ موجود ہے اور سب سے بڑھ کر جو چیز شاعری کی لطافت سے بھی زیادہ اہم ہے وہ موضوع کے ساتھ خلوص بیکراں جو کلام کے بحر ذخار میں امواج مضطر کی طرح ہیں جن کے زیر و بم میں ایک خاص انداز ہے جو ان کی سب سے اہم خوبی کہی جاسکتی ہے خود کہتے ہیں ۔

آپ کی ہر غزل میں اے سید
ساز ہندی ہے لے حجازی ہے

مولانا کی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے وہ عشق حقیقی میں اس طرح غرق ہیں کہ انہیں سب کچھ اسی میں نظر آتا ہے مثلاً ۔

در پیر مغاں میخانہ - عشق و محبت ہے
یہاں ہے زہد و تقویٰ آپ کا مے نوش ہو جانا

مولانا کا یہ شعر کتنا دلکش و دلفریب ہے ان کا یہ شعر حافظ شیرازی، مولانا روم اور عرفی وغیرہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے پیر مغاں، مے خانہ، مے نوش وغیرہ کا استعمال اردو اور فارسی شاعری کی روایات رہی ہے سید نے اس روایت کو اپنی شاعری میں برقرار رکھا ہے جس کی مثال مذکورہ بالا شعر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں

جدت آفرینی، نکتہ بیانی، اچھوتہ پن، کنایہ، تشبیہ وغیرہ سب کچھ موجود ہے مثال کے
طو پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۛ

فلک پر کھلکھلاں صورت زمین پر ذو فشاں سیرت
سراپا نور ہیں گرد و غبار گنبد خضریٰ

معران کی کیفیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی پل میں فرش سے
عرش تھے اس نازک احساس کو سید صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۛ

ابھی ہو جائے گا ٹے فرش سے تا عرش سب سید
مجھے یاد آگئے چابک سوار گنبد خضریٰ

سید نے اپنی شاعری میں فارسی مصرعوں کا بھی استعمال کیا ہے جس میں ایک
اردو مصرع ہے تو دوسرا فارسی مصرع مثلاً ۛ

جس کا ہو گفتمہ گفتمہ - حق کون سی ہے خلق
بعد از رسول پاک کہ شد تاجدار خلق

یہ شعر قولِ باری تعالیٰ "وما ینطق عن الہوی ان ہوا الا وحی یوحی" کا
ترجمان ہے یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات خدا کا قول ہے رسول صلی اللہ علیہ
وسلم جیسا اس خوبی کا مالک اور مخلوق کا تاجدار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

اردو کی صوفیانہ شاعری میں خواجہ میر درد، آسی غازی پوری وغیرہ کے بعد سید
صاحب نے مسائل تصوف کو بڑی خوش اسلوبی سے قلمبند کیا ہے مثلاً ۛ

نام ہی نام ہے کچھ ہے حقیقت کے سوا
راستہ کوئی نہیں ان کی شریعت کے سوا

کچھ نہیں ہے مری اس ہستی - بے بود کی بود
 خواب غفلت کے سوا وہم کی علت کے سوا
 سچ تو یہ ہے یہی سب کچھ ہے کہ کچھ بھی نہ رہے
 طلب و طالب و مطلوب میں وحدت کے سوا
 غیر ممکن ہے کہ ظاہر ہو مظاہر سے جدا
 کثرت جلوہ نہیں جلوہ - وحدت کے سوا
 بس فقط ولولہ - حب کا تماشاً سمجھو
 کیا حقیقت ہے مری اس کی مشیت کے سوا
 مرحبا مستوی عرشِ الہی ہو کر
 لا ماکا کون گیا ہے مرے حضرت کے سوا
 سید نے ایک نظم تحریر کی ہے جس کا عنوان "ساغر مے" ہے جس میں وہ اپنے
 شوق کا عکس دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں -

اتار لایا ہے شیشہ میں ان کو ساغر مے
 شراب پیتے ہی دیکھا کہ ہے شراب میں یار

اس طرح کے پیشمار اشعار سید کے مجموعہ - کلام میں بھرے پڑے ہیں جن سے
 کی نازک مزاجی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کرنا ہی
 تا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک مشہور مترجم قرآن عالم اور مصنف ہی نہیں مایہ ناز
 عراور عاشق رسول نعت گو بھی تھے۔

(۷)

مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

محمد نعیم الدین نام، تخلص نعیم، ۲۱ صفر ۱۳۰۰ھ مطابق یکم جنوری ۱۸۸۳ء کو پیر کے دن مراد آباد میں پیدا ہوئے تاریخی نام غلام مصطفیٰ تھا اور ان کے والد مولانا محمد معین الدین نزہت تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوئے۔ اردو، فارسی والد ماجد سے پڑھی۔ ملا حسن تک درس نظامی حضرت مولانا شاہ فضل احمد سے حاصل کیا۔ مدرسہ امدادیہ میں مولانا سید گل محمد سے جو عظیم محدث تھے درس نظامی اور دورہ حدیث کی تکمیل کے بعد فتاویٰ نویسی سیکھی۔ طب مولانا شاہ فضل احمد امرہوی سے پڑھی۔ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں دستار بندی ہوئی ان کے والد بزرگوار نے سنہ دستار بندی کے لیے یہ قطعہ تاریخ کہا ہے

ہے میرے بھر کو طلبہ پر وہ فضیلت
سیاروں میں رکھتا ہے جو مرتخ فضیلت
نزہت نعیم الدین کو کہہ کے سنا دے
دستار فضیلت کی ہے تاریخ "فضیلت"

۱۳۲۰ھ

شاہ ابو احمد علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے مرید ہوئے اور انہوں نے خلافت بھی دی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی بھی خاص نظر ان پر تھی انہوں نے بھی اپنا خلیفہ بتایا متعدد مواقع پر فاضل بریلوی نے اپنا وکیل مقرر کیا، تدریس میں خاص کمال اور نرالا

تہذا تھا اپنی ان ہی خوبیوں کے تحت "استاذ العلماء" کے لقب سے نوازے گئے۔
مولانا احمد رضا خان نے "صدر الافاضل" کا خطاب بھی عطا کیا۔

مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی صاحب الرائے، مدبر اور مفکر تھے ملک کے حالات پر ان کی گہری نظر تھی آپسی جھگڑے مٹا کر انہوں نے اہل سنت کے مختلف طبقات میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے ایک دوسرے سے قریب کیا اور ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۴ء میں بمقام بنارس آل انڈیا سنی کانفرنس کر کے ہندوستان کے پانچ سو شیخ اور علماء کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء کے آغاز ہی میں شدھی تحریک کا آغاز ہوا۔ ہندو سرمایہ داروں نے سوامی شر دھاندھ کی مدد سے مسلمانوں کے خلاف زبردست تحریک چلائی جس کے جواب میں ابو البرکات سید احمد صاحب شیخ الحدیث و امیر دارالعلوم حزب اہل حنفیہ لاہور نے مولانا نعیم الدین مراد آبادی کی نگرانی اور مولانا مصطفیٰ رضا خان دیوبند کے تعاون سے اس فتنہ کے انسداد و استیصال کے لئے تبلیغی جماعت بنائی اس جماعت نے منظم طور پر شدھی فتنے کے سدباب کے لیے کام کیا اور اسلام کی تبلیغ کی۔ مولانا نعیم الدین صاحب نے اسلام کی تبلیغ تقریر و تحریر کے ذریعہ کر کے مذہب اسلام کی گرانبغا خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اپنے رسالہ "السواد الاعظم" مراد آباد کے ہر شمارہ میں قسط وار شر دھاندھ کے قرآن اور اسلام پر اعتراضات کے جوابات دیتے اور کھل کر لکھتے رہے نعیم الدین صاحب کی یہ تحریرات، اسلام اور قرآن پر غیر مسلموں کے اعتراضات کے مدلل جوابات کا ایک شاہکار ہیں۔ السواد الاعظم کی کچھ کتابتیں مولانا مبارک حسین صاحب مدیر ماہنامہ "اشرفیہ" مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ کے پاس ہیں۔

فتنہ شدھی کے سدباب کے لئے مولانا نعیم الدین صاحب نے شعبان ۱۳۴۳ھ

/ ۱۷، ۱۸، ۱۹، مارچ ۱۹۲۵ء کو مراد آباد میں علماء و مشائخ اہل سنت کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مولانا سید ابوالحمود احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا سلیمان اشرف بہاری، مولانا یعقوب حسین صاحب بلاسپوری، مولانا عبدالمجید آنولوی، مفتی عبدالحفیظ خطیب آگرہ، مولانا سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری مولانا محمد عمر صاحب نعیمی، مولانا حامد رضا خان بریلوی اور مولانا ابوالبرکات سید احمد نے شریک ہو کر اسلام کی حقانیت اور شردھانند کے اعتراضات کے جوابات کے موضوع پر تقریریں کیں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ اس تبلیغ کے سبب تقریباً ڈیڑھ لاکھ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا مولانا برہمچاری جن کو ہندو دھرم پر عبور حاصل تھا کی تبلیغ سے تقریباً پچاس ہزار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔

تصنیف و تالیف :-

مولانا نعیم الدین صاحب نے اردو تصانیف کے ذریعہ بڑا اہم رول ادا کیا وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب، مدرس، مفسر، محدث اور مصنف و شاعر تھے۔ انہوں نے بیس سال کی عمر میں الکلمة العلیا لعلاء علم المصطفیٰ تصنیف کی ان کی لکھی ہوئی ایک تصنیف تفسیر خزائن العرفان ہے اس تفسیر کے بارے میں پروفیسر عبدالقیوم لکھتے ہیں۔

”آپ (مولانا سید محمد نعیم الدین) نے خزائن العرفان کے نام سے قرآن کریم کی عمدہ تفسیر لکھی ہے“ ۲۵

ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتابیں اور رسائل انہوں نے تصنیف کیے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

۱۔ درنا یاب :-

یہ اردو زبان میں ہے اور ۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی کا ایک فتویٰ ہے جو قبر پر شاخ اور پھول ڈالنے اور اس سے میت کے تحفیف عذاب کی امید رکھنے کے شرعاً جواز کے بارے میں ایک استفتاء ہے اس رسالہ میں مولانا اور ان کے اس مسئلہ مذکور بالا میں مخالف مولوی حکیم ہدایت علی صاحب کے مابین مناظرہ کی ایک صورت پیش کی گئی ہے۔ نعیم الدین صاحب نے احادیث اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں بھر پور بحث کی ہے۔

۲۔ اسواط العذاب علی قوامع القباب :-

یہ اردو زبان میں ہے سعودیہ عربیہ کے حکمران ابن سعود نے جب قبریں مسمار کرنا شروع کیا تھا تو پورے عالم اسلام میں کھل بلی مچ گئی تھی نعیم الدین صاحب نے بھی اس کے خلاف زور قلم کا استعمال کیا اور یہ رسالہ احادیث و فقہ کی روشنی میں لکھا ہے۔

۳۔ التحقیقات لدفع التلبیسات :-

دراصل محمد عبد الحمید خادم مدرسہ اسلامیہ رحمانیہ موضع رنگپور ڈاکخانہ جلال پور ضلع فیض آباد کے ایک استفتاء کا تحقیقی جواب ہے یہ استفتاء مولانا احمد رضا بریلوی سے متعلق ہے اس کی زبان اردو ہے۔

الکلمة العلیا :- مطبوعہ حبیب المطابع دریا آباد۔ (اردو)

- ۵۔ تفسیر خزائن العرفان :- مطبوعہ (اردو)
- ۶۔ اطیب البان رد تفویت الايمان :- مطبوعہ مراد آباد ۱۴۰۴ھ (اردو)
- ۷۔ کشف الحجاب :- مطبوعہ (اردو)
- ۸۔ کتاب العقائد :- مطبوعہ تحفہ سنہ ۱۳۴۹ھ (اردو)
- ۹۔ زاد الخرمین :- مطبوعہ ناظم پریس، رام پور ۲۳ فروری ۱۹۷۱ء (اردو)
- ۱۰۔ آداب الاخیار :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۱۔ سیرت صحابہ :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۲۔ سوانح کربلا :- مطبوعہ کانپور (اردو)
- ۱۳۔ احقاق حق :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۴۔ گلبن غریب نواز :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۵۔ ریاض نعیم :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۶۔ افادات صدر الاصل :- (مجموعہ فتاویٰ) (اردو)
- ۱۷۔ پراچین کمال :- مطبوعہ (اردو)
- ۱۸۔ ارشاد الانام فی محفل المولود والقیام :- مطبوعہ (اردو)

تذکرہ۔ علما۔ اہل سنت میں محمود احمد قادری نے لکھا ہے کہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی کے مضامین الہلال و البلاغ (مدیر ابوالکلام آزاد) میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن بہت جستجو کے بعد بھی ان کے مضامین دستیاب نہیں ہوئے۔ الہلال و البلاغ کے سارے پرچے دیکھے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ اس لئے محمود احمد قادری نے جو لکھا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لی ہے چونکہ ان کو شاعرانہ ماحول ملا خود ان کے والد شاعر تھے وہ زبنت

تخلص رکھتے۔ عربی، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کی ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا۔ جس سے ان کی ہمت پہلو طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ان کی گرانقدر علمی و ادبی خدمات کا بخوبی پتا چلتا ہے اس طرح انہوں نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیئے ۶۷ برس کی عمر میں یعنی ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کو ہم سے جدا ہو گئے۔ مولانا مفتی محمد ابراہیم نے ان کی وفات پر یہ قطعہ تارخ کہا ہے۔

شوقِ نعیمِ ضد میں حضرت نعیمِ دین
دارِ فنا سے دارِ بقا کو ہوتے رواں
رضواں نے دی ندا کہ فریدی سن وصال
کہہ دو ملا بہشت بریں میں انہیں مکان

۱۳۶۷ھ

مولانا سید محمد نعیم الدین نعیم مراد آبادی کے حالات اور ادبی خدمات نشنن معلوم ہوتے ہیں اس لئے یہاں دو مقالات کا اضافہ کیا جا رہا ہے، ایک پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد کا مطبوعہ مقالہ حالات و خدمات پر ہے اور دوسرا پروفیسر فاروق احمد صدیقی (بہار یونیورسٹی، بھارت) کا مقالہ جو شاعری پر ہے۔ ناشر

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی (پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد)

صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ کی ولادت ۲۱ صفر
المظفر ۱۳۰۰ھ (یکم جنوری ۱۸۸۳ء) کو مراد آباد (یو۔ پی۔ بھارت) میں ہوئی
۱۳۲۰ھ ۱۹۰۰ء میں مدرسہ امدادیہ (مراد آباد) سے دستار فضیلت حاصل کی۔ استاد
گرامی مولانا شاہ محمد گل رحمتہ اللہ علیہ عارف کامل اور فاضل اجل تھے، فاضل ممدوح
کے عشق و محبت اور علمیت و فقہیت کی ایک جھلک ان کی تالیف ”ذخیرۃ العقبیٰ
فی استحباب مجلس میلاد مصطفیٰ“ (۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء) میں نظر آتی
ہے۔۔۔ آپ کا سلسلہ حدیث براہ راست حجاز مقدس سے مربوط ہے، برصغیر پاک و
ہند کے دوسرے سلاسل حدیث کے مقابلے میں آپ کو یہ خصوصی امتیاز حاصل
ہے۔۔۔

صدر الافاضل ایسے جلیل القدر استاد کے تلمیذ رشید تھے، وہ علوم عقلیہ و نقلیہ کے
ماہر تھے بالخصوص فن حدیث اور علم التوقیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ علم طب میں بھی
مہارت حاصل تھی اور حکیم شاہ فضل احمد امرہوی سے شرف تلمذ تھا، شاعری میں
اپنے والد ماجد اساتذہ الشعراء۔ مولانا معین الدین زہمت سے فیض حاصل کیا اور نعیم تخلص
فرماتے تھے۔ آپ کا دیوان ”ریاض نعیم“ شائع ہو چکا ہے۔

صدر الافاضل حضرت شاہ محمد گل علیہ الرحمہ سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت
تھے۔ بیعت کے بعد حضرت شاہ صاحب نے آپ کو حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی

رحمتہ اللہ علیہ (م۔ ۱۳۵۵ھ) کے سپرد کر دیا۔ صدر الافاضل نے آپ سے استفاضہ کیا اور آپ ہی سے خلافت و اجازت حاصل کی، آپ ہی کی اجازت سے فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ (م۔ ۱۹۲۱ء) سے بھی خلافت و اجازت حاصل کی۔ صدر الافاضل، فاضل بریلوی کے رازدار اور رمز شناس تھے، آپ نے ان کے مشن کو بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا اور مسلمانان ہند کی سیاسی اور مذہبی امور میں رہنمائی فرمائی۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں مراد آباد میں آپ نے مدرسہ انجمن اہل سنت و جماعت کی بنیاد رکھی۔ بعد میں ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں اس مدرسہ کا نام جامعہ نعیمیہ قرار پایا۔ اس جامعہ کے فیض یافتہ اور صدر الافاضل کے تلامذہ پاک و ہند میں بہت سے جامعات کے بانی، بہت سی کتابوں کے مصنف اور بہت سے رسالوں کے مدیر ہیں مثلاً یہ حضرات:-

۱۔ مولانا مفتی محمد عمر نعیمی علیہ الرحمہ (بانی مدرسہ بحر العلوم مخزن عربیہ، کراچی) آج کل یہ مدرسہ دارالعلوم نعیمیہ کے نام سے ایک ٹرسٹ کے زیر انتظام چل رہا ہے۔

۲۔ علامہ ابوالحسنات مولانا محمد احمد قادری علیہ الرحمہ۔۔۔۔۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے وقت اجلاس لاہور میں موجود تھے۔ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس (بنارس) میں شرکت کی۔ ۱۹۴۸ء میں تحریک آزادی کشمیر میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت میں سرگرمی سے جدوجہد کی جمعیتہ العلماء پاکستان کے پہلے صدر تھے آپ کی تصانیف میں یہ قابل ذکر ہیں:-

تفسیر الحسنات (چھ جلدیں)، ترجمہ کشف المحجوب، شمیم رسالت، شرح قصیدہ بردہ شریف، اوراق غم، صبح نور، قرطیس المواعظ، فرشتہ رحمت، اظہار الاسقام، منظر الاسرار، التبیان، مونس الاطباء وغیرہ وغیرہ

۳۔ ابوالبرکات مولانا سید احمد قادری (ناظم مرکزی مدرسہ انجمن حزب الاحناف لاہور) آپ ہی کے صاحبزادے علامہ محمود احمد رضوی بخاری شریف کے شارح اور ماہنامہ رضوان (لاہور) کے مدیر ہیں۔۔۔۔

۴۔ ابوالخیر مولانا مفتی محمد نور اللہ صاحب (بانی مدرسہ دارالعلوم حنفیہ بصیر پور ساہیوال) آپ فتاویٰ نوریہ کے مصنف ہیں۔ آپ ہی کی سرپرستی میں یہاں سے ماہنامہ "نور النجیب" نکل رہا ہے۔

۵۔ علامہ پیر محمد کرم شاہ صاحب (دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بحیرہ شریف) آپ کی تفسیر ضیاء القرآن شہرت عام حاصل کر چکی ہے، آپ کی سرپرستی اور ادارت میں پنجاب کا مسفرد علمی اور مذہبی مجلہ "ضیائے حرم" بڑی کامیابی سے نکل رہا ہے۔

۶۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی (بانی جامعہ نعیمیہ، لاہور) آپ کی سرپرستی و ادارت میں ماہنامہ "عرفات" نکل رہا ہے

۷۔ مولانا مفتی احمد یار خاں علیہ الرحمہ، آپ کی تالیف تفسیر نعیمی مقبول و معروف ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف آپ سے یادگار ہیں۔

علم المیراث، جاہ الحق، شان حبیب الرحمن، سلطنت مصطفیٰ، دیوان سالک، علم القرآن، اسرار الاحکام، مرآة شرح مشکوٰۃ شریف (آٹھ جلدوں میں)،

نعیم الباری فی شرح البخاری، نو العرفان فی حاشیۃ القرآن، مواعظ نعیمیہ،
فتاویٰ نعیمیہ، اسلامی زندگی وغیرہ۔

راقم الحروف ایام نو عمری میں صدر الافاضل کی زیارت سے مشرف ہوا ہے اور ان
کی تقاریر سنی ہیں۔ صدر الافاضل ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء سے بہت قبل مسجد جامع
فتحپوری، دہلی کی محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ۱۲ ربیع الاول کی شب کو ہر
سال تقریر فرماتے تھے، پھر ۱۲ ربیع الاول کو بعد نماز ظہر بھی تقریر فرماتے تھے۔ اس
محفل پاک کے بانی راقم کے والد ماجد حضرت مفتی اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ رحمۃ اللہ
علیہ (م۔ ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء) تھے۔ صدر الافاضل اور آپ کے درمیان نہایت ہی
مخلصانہ تعلقات تھے۔ بارہویں شب مبارک کو محفل میلاد میں شرکت فرمانا ہی اس
خصوصی تعلق و محبت کی نشاندہی کرتا ہے۔

صدر الافاضل تبلیغ اسلام اور ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت و
حمایت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ اس سلسلے میں آپ نے عیسائیوں اور آریوں سے
کامیاب مناظرے فرمائے۔ آپ نے اپنے رسالہ السواد الاعظم میں بھی ان لوگوں کا رد
کیا، مثلاً پنڈت دیانند سرسوتی کی کتاب ستیارتھ پر کاش کے اسلام اور شارع
اسلام پر اعتراضات کے مسکت و مدلل جواب دیے۔ مگر تحریر و تقریر میں کسی مقام
پر تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، اس جذباتی دور میں یہ خوبی نہایت
ہی قابل تحسین ہے۔۔۔۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے لئے المورثہ، نینی تال، ہلدوانی وغیرہ
کے پہاڑی علاقوں کا دورہ کیا، تبلیغ اسلام کے لئے وہاں قیام فرمایا اور ایک رسالہ
”پراچین کال“ تحریر فرمایا جو غالباً پہاڑی زبان میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی
ساتھ ہی ہے۔۔۔۔ اشاعت اسلام کے لئے آپ نے پھیری والوں کے روپ میں اپنے
گماشتے بھیجے جنہوں نے گھر گھر جا کر اسلام کو پھیلا یا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ علماء۔

بالعموم تبلیغ اسلام سے بے خبر تھے۔ بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی باتیں کر رہے تھے۔

۱۹۱۹ء - / ۱۳۳۸ھ اور ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت، تحریک ترک موالات کے جذباتی دور میں آپ نے تحریر و تقریر کے ذریعہ مسلمانوں تک اسلام کے سچے پیغام کو پہنچایا اور صدر جمعیتہ العلماء ہند کو ہندو مسلم اتحاد کے خطرات سے آگاہ کر کے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے سے روکا۔۔۔ پھر دہلی جا کر مولانا محمد علی جوہر کو سمجھایا بالآخر وہ ہندو مسلم اتحاد کی دعوت سے دست بردار ہو کر نائب ہو گئے۔ مولانا محمد اطہر نعیمی اپنے والد ماجد تاج العلماء سے اور وہ صدر الافاضل سے روایت کرتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن جانے سے قبل مولانا محمد علی جوہر، صدر الافاضل سے ملنے آئے، صدر الافاضل نے پھر ہندو مسلم اتحاد کے نتائج و عواقب کی طرف ان کو متوجہ کیا، اس پر انہوں نے فرمایا:-

”اگر زندہ رہا تو اس کی تلافی کی کوشش کروں گا۔“

مولانا شوکت علی خود مراد آباد جا کر صدر الافاضل کے دولت کدے پر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت و تائید سے دست کش ہوئے۔۔۔ دونوں بھائیوں کو ہندوؤں کی بیوفائی کا شدید احساس تھا۔

گورگوکل کی تحریک چلائی گئی تو صدر الافاضل نے اس کے مقابلے کے لئے اعظم و اکابر اہل سنت کو مراد آباد جمع کیا، جہاں ۱۹۲۵ء - / ۱۳۴۴ھ میں آل انڈیا سنی کانفرنس (الجمعیۃ العالیۃ المرکزیۃ) کی بنیاد رکھی گئی جس کے ناظم اعلیٰ صدر الافاضل منتخب ہوئے اور مستقل صدر حضرت محدث علی پوری، پیر سید جماعت علی شاہ علیہ الرحمہ (م ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء)۔

۱۹۲۴ء - / ۱۳۴۳ھ اور ۱۹۲۵ء - / ۱۳۴۴ھ کے درمیان شذھی کی تحریک

چلی تو اس کی مدافعت کے لئے صدر الافاضل نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بریلی میں جماعت رضائے مصطفیٰ قائم کی گئی۔ جس کے تحت اس فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا گیا، صدر الافاضل نے آگرے کو اپنا سپید کوارٹر بنایا اور بالآخر شردھانند کے اس فتنے کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۸ء میں مراد آباد سے ماہنامہ ”السواد الاعظم“ جاری کیا اور اس کے ذریعہ مذہبی اور سیاسی میدانوں میں مسلمانان ہند کی رہنمائی فرمائی، اس شعر سے آپ کے عزم و حوصلہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پھر جنوں کہتا ہے خود کو پابہ جولاں دیکھیے

چلیے اٹھیے، اب کے پھر وحشت میں زنداں دیکھیے

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس (لندن) میں جب علامہ اقبال نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تو آپ نے اس کی پرزور تائید کی اور اس تجویز کے مخالف ہندو اخبارات و رسائل کا خوب تعاقب فرمایا اور اپنے موقف کی حمایت میں نہایت معقول اور دل نشیں دلائل پیش کئے۔۔۔۔۔ ۱۹۴۰ء - ۱۳۵۹ھ جب لاہور میں ”قرارداد پاکستان“ منظور ہوئی تو اس موقع پر آپ کے تلمیذ رشید مولانا ابوالحسنات محمد احمد علی الرحمہ موجود تھے اور جلسہ کے سرگرم کارکن تھے۔ ۱۹۴۶ء میں نواب محمد اسماعیل خاں (صدر۔ یو۔ پی مسلم لیگ) کے ذریعہ قائد اعظم کو تار دلوایا کہ جب تک حکومت برطانیہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی علاقے کے درمیان ایک بین الاقوامی آزاد علاقہ تسلیم نہ کر لے، تقسیم کی تجویز منظور نہ کریں۔

۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۶ء میں صدر الافاضل ہی کی کوششوں سے بنارس (بھارت) میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے چار روزہ تاریخی اجلاس ہوئے (یعنی ۱۲ اپریل تا ۳۰ اپریل)۔۔۔۔۔ اس کانفرنس میں پاک و ہند کے دو ہزار علماء و مشائخ اور ۶۰ ہزار

دوسرے حاضرین شریک تھے۔ ”قرارداد پاکستان“ کی حمایت میں جو تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ اس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

”آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ پاکستان کی پر زور حمایت کرتا ہے۔“

(خطبہ۔ صدارت جمہوریت اسلامیہ، مطبوعہ (مراد آباد) ۱۹۴۶ء، ص ۲۹)

مطالبہ پاکستان کی حمایت و اشاعت کے لئے صدر الافاضل نے ہندوستان اور پاکستان کے دور دراز علاقوں کا دورہ کیا، حتیٰ کہ مراد آباد سے بنگال تک تشریف لے گئے اور وہاں مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی جو آگے چل کر مشرقی پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں معین و مددگار ثابت ہوئی۔

آل انڈیا سنی کانفرنس کے مذکورہ بالا اجلاس کے بارے میں حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء) کے تاثرات قابل توجہ ہیں۔۔۔۔۔ مولانا نے موصوف کی ذات تحریک آزادی ہند میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔۔۔۔۔ آپ تحریک خلافت میں علی برادران کے ساتھ رہے۔۔۔۔۔ تحریک شدھی میں اس کی سخت مزاحمت کی۔۔۔۔۔ بنگال میں مولوی حسین احمد کے مقابلے میں مسلم لیگ کے نمائندے کو کامیاب کرایا۔۔۔۔۔ ۲۳، مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں قائد اعظم کے سامنے قرارداد پاکستان کی حمایت میں پر زور تقریر فرمائی۔۔۔۔۔ ۱۹۴۵ء میں دہلی دکن اور قائد اعظم کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کی،۔۔۔۔۔ ۱۹۴۶ء۔۔۔۔۔ میں علماء کا وفد حجاز لے گئے اور حکومت سعودیہ کو پاکستان کی حمایت پر آمادہ کیا۔۔۔۔۔ الغرض انہوں نے تنہا وہ خدمات انجام دیں جو ایک جماعت کے بس کی نہ تھیں۔۔۔۔۔ ایسا مجاہد جب کوئی بات کہے تو وہ بات معمولی نہیں، بہت وزنی ہے۔۔۔۔۔ آل انڈیا سنی کانفرنس (۱۹۴۶ء) کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔

” میں نے اپنی چوالیس سالہ قومیات کی زندگی میں صدہا کانفرنسیں دیکھیں اور بیسیوں خود منعقد کیں لیکن میں کہتا ہوں کہ بنارس کی سنی کانفرنس کی طرح گزشتہ چالیس سالوں میں کوئی کانفرنس بھی نہ ہو سکی۔“

(غلام معین الدین! حیات صدر الافاضل، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۰)

پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد صدر الافاضل لاہور اور پھر کراچی تشریف لائے، دستوری خاکہ کے لیے آپ سے عرض کیا گیا لیکن اچانک طبیعت ناساز ہو گئی اور واپس ہندوستان تشریف لے گئے اور پھر وہاں مالک اسلامیہ اور خلافت عثمانیہ کے دساتیر و قوانین کو سامنے رکھ کر پاکستان کے لیے ایک اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنا شروع کیا، ابھی ۱۱ دفعات لکھنے پاتے تھے کہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ (۲۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کو مراد آباد میں وصال فرما گئے۔ مزار مبارک جامعہ نعیمیہ (مراد آباد) کے احاطہ میں واقع ہے۔

صدر الافاضل کی اولاد امجاد میں چار فرزند ہوتے جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مولوی ظفر الدین (۲) مولوی محمد اختصاص الدین، (۳) جناب ظہیر الدین

(۴) جناب اظہار الدین

السواد الاعظم کے مطالعہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ۲۱، ۲۳ و ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء کو طاعون کی وبا میں یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں فوت ہو گئیں۔ اس وقت صدر الافاضل علی پور تشریف رکھتے تھے اور تدفین کے بعد دولت کدے پہنچے اس لئے یہ غم معمولی غم نہ ہو گا۔ دو صاحبزادیاں اور تھیں۔ ایک زوجہ مولوی حکیم سید یعقوب علی (مقیم کراچی) اور دوسری زوجہ حافظ سید حامد علی (مقیم مراد آباد)

صدر الافاضل متبحر عالم اور صاحب بصیرت سیاستداں تھے۔ علمیت کا اندازہ اس

سے ہوتا ہے کہ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے الطاری الداری کا مسودہ آپ کو دکھایا۔ اور جب آپ نے بعض ترمیمات کی سفارش کی تو قبول کر لی گئیں۔۔۔۔۔ آپ نے بیس سال کی عمر میں الکلمة العلیا علاء علم المصطفیٰ تصنیف فرمائی۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ کتب و رسائل آپ سے یادگار ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

تفسیر خزائن العرفان، اطیب البیان، مجموعہ فتاویٰ، تبرکات صدر الافاضل، سوانح کربلا، کتاب العقائد، ابتدائی، اسواط العذاب، آداب الاخیار، فراتد النور، کشف الحجاب، التحقیقات لدفع التلبیسات، زاد الحرمین، ریاض نعیم، گلبن غریب نواز، پراچین کال، احقاق حق، ارشاد الآنام فی محفل المولود والقیام وغیرہ وغیرہ

صدر الافاضل کی تصانیف مراد آباد سے بھی شائع ہوئیں اور ادارہ نعیمیہ رضویہ لاہور ازہربک ڈپو (کراچی)، مکتبہ اہل سنت (کراچی) نوری کتب خانہ لاہور، اور مکتبہ فریدیہ کراچی نے بھی بعض کتابیں شائع کی ہیں۔

الغرض صدر الافاضل چودھویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر عالم اور ماہر سیاست داں تھے، مذہب و سیاست پر ان کی بہت گہری نظر تھی پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہونے والی تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند میں پروفیسر عبدالقیوم نے بجا طور پر صدر الافاضل کے لئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے:-

مولوی سید نعیم الدین مراد آبادی ایک جلیل القدر عالم دین اور نامور فاضل تھے اور ہزاروں لوگ آپ کے فیض سے بہرہ ور ہوئے، آپ نے خزائن العرفان کے نام سے قرآن کریم کی ایک عمدہ تفسیر لکھی ہے۔ (جلد دوم۔ ص ۴۲۳)

مآخذ و مراجع

- احمد رضا خان: الاستمداد، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۹۱
- اقبال احمد فاروقی: حواشی الاستمداد، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء۔ ص ۹۱، ۹۲
- سید محمد محدث کچھوچھوی: خطبہ - صدارت، جمہوریت اسلامیہ، مطبوعہ بریلی ۱۹۴۶ء۔ ص ۲۹
- سید محمد جیلانی: المیزان، امام احمد رضا نمبر، مطبوعہ بمبئی ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۸۸
- عبدالقیوم پروفیسر: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء۔ ص ۴۲۳
- غلام معین الدین نعیمی: حیات صدر الافاضل، مطبوعہ لاہور اکابر تحریک پاکستان، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۶ تا ۲۷۴
- محمد عبدالحکیم شرف قادری: تذکرہ اکابر اہل سنت، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۶ء۔ فاضل بریلوی اور ترک موالات، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء۔ ص ۷۷ تا ۸۰
- محمد مسعود احمد: مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) جلد دہم جز پنجم کتاب العقائد، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۳ء۔ سوانح کربلا، مطبوعہ کراچی
- محمد نعیم الدین مراد آبادی: تذکرہ علمائے اہل سنت، مطبوعہ کانپور، ص ۲۵۳
- محمد نعیم الدین مراد آبادی: محمود احمد قادری:

ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء - ص ۹ تا ۵۶	السواد الا عظم (مراد آباد):
ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء	السواد الا عظم (مراد آباد):
صفر المظفر ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء	السواد الا عظم (مراد آباد):
رمضان و شوال ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء - ۵	السواد الا عظم (مراد آباد):
۲۱، نومبر ۱۹۷۶ء - ص ۶، ۵	الہام (بہاولپور):

نوٹ:- بعض معلومات مندرجہ ذیل علماء سے حاصل کیں

- ۱- مولانا غلام محی الدین فریدی نعیمی (ابن حکیم غلام احمد فریدی خلیفہ فاضل بریلوی و برادر عم زاد صدر الافاضل)
- ۲- مولانا محمد اطہر نعیمی (ابن مفتی محمد عمر نعیمی تلمیذ رشید صدر الافاضل و مہتمم جامعہ نعیمیہ، مراد آباد)

<http://t.me/Telqigat>

صدر الافاضل ”ریاضِ نعیم“ میں

پروفیسر فاروق احمد صدیقی (بہار یونیورسٹی)

حضرت صدر الافاضل کی جامع اوصاف و حامل کمالات شخصیت، علمائے اہل سنت و جماعت کی زریں تاریخ میں بے حد ممتاز و محترم ہے۔ وہ ایک عالم متبحر، استاذ اجل، مفسر قرآن، محدث کبیر مناظر بے عدیل اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے معتمد و کیل تھے۔ آپ کی شخصیت شش بہت، بہر رخ کامیاب و بے مثال ہے۔ انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا اپنی عظمت و انفرادیت کا پرچم لہرا دیا۔ اور جس موضوع پر لکھا فکر و تدبر کی گہری چھاپ چھوڑی۔

ان کی تقریباً ایک درجن تصنیفات اور مختلف تنظیمی و تحریری سرگرمیاں اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ تھے۔ اس لئے ان کے گونا گوں کارناموں کا احاطہ کرنے کے لئے واقعی ایک مستقل ادارہ کی ضرورت ہے۔

میں نے ابھی ابھی صدر الافاضل کی چند امتیازی خصوصیات کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ان کی ایک اور اہم خصوصیت جو عام نگاہوں سے اوچھل ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک خوش فکر و خوش کلام شاعر بھی تھے۔ میں اس وقت اس سے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ محتاج وضاحت نہیں کہ آپ کو شعری ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سید معین الدین نزہت بڑے پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنے عہد کے استاذ شاعروں میں ان کا شمار تھا۔ یہاں بطور نمونہ میں ان کے دو اشعار نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو ایک مخصوص پس منظر میں کہے گئے ہیں۔ وہ یہ کہ آپ ابتداً مولوی قاسم نانوتوی کے مرید تھے۔ جب آپ کو ان کی بد عقیدگی سے مطلع

کیا گیا تو آپ نے فوراً نسخ بیعت کر کے رجوع کیا اور یہ اشعار کہے ۷
 پھرا ہوں اس کی گلی سے نزہت ہوں جس میں گمراہ شیخ و قاضی
 رضائے احمد اسی میں سمجھوں کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی
 اس شعر کا مصرعہ ثانی جو دعوتِ پیغام دے رہا ہے آج بھی اس کی اہمیت و
 صداقت مسلم ہے۔ خوش عقیدہ مسلمان کا۔ ہی وظیفہ و ترانہ ہونا چاہئے کہ ۸
 رضائے احمد اسی میں سمجھوں کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی
 خیر یہ گفتگو بطور جملہ معترضہ آگئی تھی۔ جہاں تک صدر الافاضل کی شاعرانہ
 دلچسپیوں اور کارگزاریوں کا تعلق ہے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان
 کی حیثیت ان کے دیگر کارناموں کے تقابل میں ضمنی اور ثانوی تھا۔ ان کی زندگی
 پاک کا اصل مقصد مشن محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت کا پرچم
 بلند کرنا اور ان کے گستاخوں کی سرکوبی کرنا تھا۔۔۔ اس لئے وہ تصنیفی و تحریری
 سرگرمیوں میں زیادہ مصروف و مہمک رہے۔ اور شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہ
 دے سکے۔ ”ریاضِ نعیم“ میں شامل ان کا کلام جو مختلف اصناف و موضوعات پر
 ہے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر آپ نے تھوڑی سی توجہ اور فرمائی ہوتی تو
 آپ کی شاعرانہ عظمت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا۔

”ریاضِ نعیم“ مرتبہ حضرت مولانا معین الدین نعیمی ایک ایسا حسین شعری
 گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ و بو کے پھول موجود ہیں، حمد، نعت، منسبت، غزل اور
 مناجات وغیرہ۔ بظاہر یہ بہت مختصر شعری مجموعہ ہے جس میں صرف ایک حمد، ۱۷
 نعتیں (۱۵ اردو اور ۲ فارسی)، ۳ منسبت (۲ اردو ایک فارسی)، ۱۴ غزلیں (۱۲ اردو، ۲
 فارسی)، ایک قطع اور کچھ مخمس اور تفسمین ہیں لیکن یہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا حامل
 ہے۔

مجموعہ کا آغاز خدائے پاک کی حمد سے ہوتا ہے۔ اس میں حضرت صدر الافاضل نے خدائے قدیر کی عظمت و تقدیس بیان کرتے ہوئے اس کی تمام صفتوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایک لفظ سے کمالِ عبودیت اور انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ پیرایہ زبان میں بڑی پاکیزگی، طہارت اور نفاست ہے۔ عربی و فارسی کے بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے کی بجائے روزمرہ کی ٹکسالی زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہندی کے آسان عام فہم اور خوبصورت الفاظ بھی آپ نے بڑی چابکدستی سے موتی کی طرح پروئے ہیں۔ اسلئے سادگی زبان اور پاکیزگی بیان دونوں کا حسین امتزاج یہاں نظر آتا ہے۔ ردیف میں میرامولی کی تکرار حرفِ میم پاک کی حلاوت و شیرینی سے زبان کو طراوت بخشتی ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

سب کا پیدا کرنے والا میرامولی میرامولے
سب سے افضل سب سے اعلیٰ میرامولی میرامولے

جگ کا خالق، سب کا مالک، وہ ہی باقی باقی مالک
سچا مالک، سچا آقا میرامولی میرامولے

رازق، داتا پالن ہارا میرامولی میرامولے

جہاں تک ان کی نعتیہ شاعری کا تعلق ہے وہ عشق و وارفتگی کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جو ہماری مسرت و بصیرت میں خوبصورت اضافے کرتا ہے اس میں خلوص کی خوشبو بھی ہے اور عقیدت کی روشنی بھی ایمان کی لذت و حلاوت بھی ہے اور بیان کی نفاست و پاکیزگی بھی یعنی ایک حیات آفریں اور روح پرور فضا نے ان کی نعتوں کو دلکشی و رعنائی کا مرقع بنا دیا ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری برائے شاعری نہیں کی

ہے بلکہ جذبہ بے اختیار شوق کے تحت کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہر جگہ ازدل خیزد بردل ریزد کی کیفیت نظر آتی ہے مثال کے طور پر ان کی ایک نعت کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شبِ غمِ حبی آخر بسر ہو گئی
تڑپتے تڑپتے سحر ہو گئی

مرے دردِ دل کی خبر ہو گئی
جو چشمِ کرامت ادھر ہو گئی

مدینہ کا دیدار مشکل نہیں
نگاہِ عنایت اگر ہو گئی

دیارِ نبی میں گذر ہو گئی
یہ تقدیر کس اوج پر ہو گئی

مواہجہ میں عرضِ صلوة و سلام
مری آبرو اس قدر ہو گئی

ان اشعار میں عقیدت کی فراوانی تو ہے ہی آسان اور سادہ الفاظ نے حد درجہ دلکشی پیدا کر دی ہے۔ الفاظ و خیالات میں اک سیل سبک کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اسلوب میں روانی، برجستگی اور حیرت انگیز تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ پوری نعت بحر متقارب میں کہی گئی ہے جس سے اس کی نغمگی و ترنم دو بالا ہے۔

نعتیہ شاعری کا ایک اہم موضوع حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ پاک کی زیارت کی آرزو اور اشتیاق ہے میرے خیال میں کوئی ایسا مداحِ رسول نہیں جس نے اس نفسِ موضوع پر ایک دو اشعار نہیں کہے ہوں، حضرت صدر الافاضل جیسے عاشقِ رسول بھلا کیسے اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتا، دیکھیے ایک عاشقِ صادق زیارتِ محبوب

کے لئے کس طرح مچل رہا ہے ۷

چہرہ - پاک سے نقاب آپ ذرا اٹھائیں تو
 حسن خدا نما کی شان، شان خدا دکھائیں تو
 کشتہ - عشق سیدی آپ کے نام پر مرے
 جلوہ انہیں دکھائیے آپ اگر جلاتیں تو
 کرنے کو جان و دل فدا روضہ - پاک پر شہا
 پہنچے نعیم بے نوا آپ اگر بلائیں تو
 طلبِ صادق تھی اس لئے واقعی آقائے دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے نعیم
 کو اپنے روضہ پاک پر بلا کر ان کی شفاعت اپنے ذمے کر لی ۷

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جاتے ہے
 قرآن و حدیث سے ہمیں جو عقیدہ ملا ہے اس کے مطابق حضور سرور عالم صلی
 اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے اور ساری کائنات کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ وہی جان ایمان اور
 مدارِ نجات ہیں۔ ان کے آستانہ کرم سے دور رہنے والے کے لئے نہ کہیں مفر ہے نہ
 مقر، اس لئے حضرت صدر الافاضل ایمان و عقیدت کی توانائی کے ساتھ فرماتے ہیں ۷

درد و الم کے مبتلا جن کی کہیں نہ ہو دوا

دیکھیں وہ شان کبریا آپ کے در پہ آئیں تو

بد ہیں اگر چہ ہم حضور آپ کے ہیں مگر ضرور

سامنے کس کے سر جھکائیں آپ ہمیں بتائیں تو

آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں ”آپ ہمیں بتائیں تو ”لب و لہجہ کی

شائستگی و شستگی بر جستگی و اثر آفرینی پر دال ہے۔ یقین کی کیفیت عقیدت کی

پختگی عشق کا واہانہ پن اور اظہار کی بے ساختگی نمایاں ہے۔ عشق صادق کا ایک تقاضہ

یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ اس کی منزل و قیام گاہ درو دیوار، گنبد و مینار، گلی کوچے بلکہ اسکے ذرے ذرے سے عقیدت و محبت آشکارا ہو، ایک عربی شاعر کہتا ہے

فی مذہبی حب الدیار لا ہلھا
و للناسِ مِمَّا یعشقون مذاہب

(ترجمہ: میرے مذہب میں دیار سے محبت کرنا صاحبِ دیار کی وجہ سے ہے اور عشق میں لوگوں کے الگ الگ مذہب ہوا کرتے ہیں)

چنانچہ حضرت صدر الافاضل نے جلوہ گاہ محبوب مدینہ طیبہ اس کے اطراف و اکناف صحرا و گلزار اور خاک و ذرات سے بھی گہری عقیدت کا اظہار فرمایا ہے، وہ اس ارض مقدس کی ہواؤں کو صحت بخش ہی نہیں زندگی بخش قرار دیتے ہیں۔ وہاں کے چمن کی بہار تو جان بہار ہے، صحرائے مدینہ کی ہواؤں میں اتنی قوتِ نمودِ تاثیر ہے کہ اس سے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں مسکرا اٹھتی ہیں کس سرشاری و وارفتگی سے فرماتے ہیں۔

اے بہارِ زندگی بخشِ مدینہِ مرجبا
اے فضائے جا نفرائے باغِ طیبہِ مرجبا
غنجیہ پزمرہٴ دل کو شگفتہ کر دیا
مرجبا اے بادِ صحرائے مدینہِ مرجبا
سرمہٴ نورِ بمر ہو آ کے میری آنکھ میں
مرجبا صد مرجبا اے خاکِ بطحاِ مرجبا

ایمان تو یہ ہے کہ جس طرح ذکرِ الہی سے دلوں کو اطمینان اور چین نصیب ہوتا ہے اسی طرح یادِ مصطفیٰ بھی ایسی روح افزا ہوتی ہے کہ عاشقِ صادق سانس لیتا ہے تو جنت

کی ہوا آتی ہے اور قلب فرحت انبساط سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے صدر الافاضل نے کیا خوب کہا ہے ۷

کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو تمہارا نام لینے سے
محمد مصطفیٰ تم ہو، حبیب دو جہاں تم ہو
حضرت صدر الافاضل کی نعتوں میں ایک واضح فکری عنصر یہ نظر آتا ہے کہ آپ
عالم اسلام کے آلام و اضطراب اور باہمی نفاق و انتشار کو دیکھ کر حد درجہ دل شکستہ اور
محزون ہیں۔ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ اور ان کا وقار مجروح دیکھ کر ان کا دل خون
کے آنسو رو رہا ہے اور خاص طور پر اخوتِ اسلامی کا پیرہن تار تار دیکھ کر وہ بے حد
مضطرب ہیں۔ چنانچہ بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں استغاثہ فرماتے
ہیں ۷

اب کیجئے ایسا کرم، ہو دین کا اونچا علم
کفار کی گردن ہو خم، ان کا مٹے نام و نشان
اسلام کی لیجئے خیر اور کفر کو پہنچے ضرر
کفار ہوں زیر و زبر سب بھول جائیں مستیاں
مسلم کو پھر شوکت ملے، اسلام کو قوت ملے
بد خواہ کو ذلت ملے، اسے دینِ حق کے پاسباں
مسلم ہوں باہم متحد، بھائی کا بھائی ہو مد
مٹ جائے سب آپس کی ضد رشک و حسد سے ہواں

مذہبی شاعری کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ وہاں فکر بلند تو ملتی ہے
لیکن فنِ لطیف کی کمی شدت سے کھٹکتی ہے یعنی شاعری فکر منظوم کا نمونہ بن کر
رہ جاتی ہے یہ خیال بالکل غلط تو نہیں ہے لیکن اردو کے نعت گو شاعروں میں کم از کم

حضرت امام احمد رضا بریلوی، حضرت محسن کاکوروی، علامہ حسن بریلوی پر اس کا انطباق ہرگز نہیں ہوتا اور حضرت صدر الافاضل نے بھی اپنے اکثر اشعار میں شعری لطافت قائم رکھنے میں حیرت انگیز فن کارانہ مہارت دکھائی ہے۔ بطور مثال یہ اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔

سرِ اِپا نور ہیں وہ نورِ حق نورِ علی نور
 کِمشکوٰۃ ہے شان ان کی انہیں کیا واسطہ نخل سے
 بفضل اللہ نابینا نہیں ہوں کیسے نسبت دوں
 کفِ پائے صیبِ حق کو روئے ماہِ کمال سے

دیکھتے وہ عارض اور وہ زلف مشکیں دیکھتے
 صبحِ روشن دیکھتے، شامِ غریباں دیکھتے
 جلوہ فرما ہیں جبینِ پاک میں آیاتِ حق
 مصحفِ رخ دیکھتے، تفسیرِ قرآن دیکھتے

تمنائیں مچلتی ہوں عطائیں لطف کرتی ہوں
 دعاؤں کی اجابت کر رہی ہو ناز برداری
 ”ریاضِ نعیم“ میں حضرت صدر الافاضل کی تین منسبتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک امام
 عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام کی شان میں دوسری حضرت علی اکبر رضی اللہ
 عنہ کی شان میں اور تیسری شبیبہ غوثِ اعظم حضرت مولانا شاہ علی حسین اشرفی
 رحمت اللہ علیہ کی شان میں (یہ بزبان فارسی ہے) تینوں منسبتیں عقیدت و احترام کے
 بے پایاں جذبات سے لبریز ہیں لیکن میں یہاں حضرت علی اکبر کی منسبت کے کچھ

اشعار پیش کروں گا کہ ان میں شعریت اپنے عروج پر ہے اور فکر کی قامت پر فن کی
قباہل چست و درست نظر آتی ہے، یوں کہیے آگینہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے
ہے۔ سراپا نگاری کا ایسا حسین و مصور نمونہ انہیں جیسے مسلم الثبوت اساتذہ کے یہاں
ہی ممکن ہے۔

صورت تھی انتخاب تو قامت تھا لا جواب
گیو تھے مشک ناب، تو پہرہ تھا آفتاب
پہرہ سے شاہزادہ کے اٹھا ہی تھا نقاب
مہر سپہ ہو گیا خجالت سے آب آب
کا کل کی شام، رخ کی سحر، موسم شباب
سنبیل نثارِ شام فدائے سحر گلاب
شاہزادہ - جلیل علی اکبر جمیل
بستانِ حسن میں گل خوش منظر شباب
پالا تھا اہل بیت نے آغوشِ ناز میں
شرمندہ اس کی ناز کی سے شیشہ - حباب
خورشید جلوہ گر ہوا پشت سمبذ پر
یا ہاشمی جو ان کے رخ سے اٹھا نقاب
صولت نے مرحبا کہا شوکت تھی رجز خواب
جرات نے باگ تھامی شجاعت نے لی رکاب

یہ رواں دواں انداز، یہ زور بیان، تشبیہات کی تازگی، استعاروں کی ندرت، شاعر
کا مقام و مرتبہ صف اول میں محفوظ کر لی جائے۔

اس منسبت میں ۲۱ اشعار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کاہر شعر کرشمہ دامنِ دل

می کشد کہ جا اینجاست کا حال ہے۔ حضرت صدر الافاضل نے ایک نظم قاتلان اہل بیت کی مذمت میں بھی کہی ہے اس میں جذبات کا سیدھا سادہ بیان اور عبرت کی کئی تصویر ہے۔

اے ابن سعد رے کی حکومت تو کیا ملی
ظلم و جفا کی جلد ہی تجھے کو سزا ملی
اے شہر نابکار شہیدوں کے خون کی
کسی سزا تجھے ایسی اے نا سزا ملی
دنیا پرستو دین سے منہ موڑ کر تمہیں
دنیا ملی نہ عیش و طرب کی ہوا ملی

”ریاضِ نعیم“ میں تقریباً ۱۶ غزلیں ہیں۔ صنفِ غزل جس رندی اور بواہوسی کے لئے بدنام ہے۔ حضرت صدر الافاضل کی غزلوں کا ان سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہاں عروسِ غزل نامحرم نہیں بلکہ محرم بن کر ان کے حریم فکر میں آتی ہے۔ اور نہایت ادب سے ان کی قلم بوس ہے۔ ان کی غزلیں ہوں یا ان کی فارسی شاعری (جو نعت و غزل اور منسبت پر مشتمل ہے) دونوں علاحدہ اور مستقل مطالعے اور مقالے کی مستقاضی ہے۔

صنفِ غزل معنوی طور پر جس شاہد بازی اور کنگھی چوٹی کیلئے مطعون ہے اس کا ”ریاضِ نعیم“ کی غزلوں میں دور دور تک سایہ نہیں۔ پاکیزہ تغزل فکر کی طہارت جذبات کی تہذیب صنفِ غزل کی نزاکت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ ریاضِ نعیم کی یہ ۱۶ غزلیں مستقل ایک الگ اور بحر پور مقالے کی مستقاضی ہیں۔ لہذا سر دست میں ان سے صرف نظر کرتا ہوں۔

(۸)

مولانا محمد امجد علی اعظمی

پورا نام محمد امجد علی ہے۔ محمد امجد علی محلہ کریم الدین پور قصبہ گنوسی ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی) میں ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام مولانا حکیم جمال الدین، دادا کا نام مولانا خدابخش اور پردادا کا نام مولانا خیر الدین تھا۔ ان کے والد ماجد اور جد امجد فن طب اور علم و فضل میں باکمال تھے۔ ابتدائی کتابیں جد امجد سے پڑھیں اس کے بعد اپنے چچیرے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب سے علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر انہیں کے مشورہ سے مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری (م ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخل ہوئے۔ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد مولانا وصی احمد محدث سورتی (م ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء) کے پاس مدرسہ الحدیث پہلی بھیت میں حاضر ہوئے اور حدیث کا درس لیا اور ۱۳۳۰ھ / ۱۹۰۲ء میں سند حاصل کی۔ ۱۳۲۳ھ میں حکیم عبدالولی چھوٹی ٹولہ لکھنؤ سے علم طب حاصل کیا۔ ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۲۷ھ تک مولانا وصی احمد سورتی کے مدرسہ میں درس دیا اس کے بعد ایک سال تک پٹنہ میں طب کا کام کیا بعد میں اپنے استاد مولانا وصی احمد سورتی کے کہنے پر طب کا کام چھوڑ کر مولانا احمد رضا بریلوی کے مدرسہ منظر اسلام بریلی میں درس و تدریس کا کام انجام دینے لگے۔ مولانا احمد رضا بریلوی کی صحبت میں رہ کر ان کے علم میں وسعت پیدا ہوئی اور اس وقت کے فقیہوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

مولانا امجد علی بڑے ذہین تھے ذاتی اور خداداد خوبیوں کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے ہیں:-

”کسی کتاب کا یاد کرنے کی نیت سے تین دفعہ دیکھ لینا کافی ہوتا تھا“

حافظہ کی یہ قوت خدا کسی کسی کو بخشتا ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ طالب علمی ہی سے وہ اپنی علمی صلاحیتوں کی داد حاصل کرتے آئے اور آخر عمر تک خراج تحسین حاصل کیا۔

انہوں نے ابتدائی سے درس کا اہم فریضہ اپنے لیے چنا اور اسی پیشہ کو اپنی نجات سمجھا۔ ایک لمبے عرصے تک مدرسہ منظر اسلام بریلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۲۴ء میں صدر المدرسین کی حیثیت سے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر (راجستھان) چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں پھر بریلی واپس آئے اور کچھ دنوں کے بعد نواب حاجی غلام محمد خاں شروانی ریٹس ریاست دادوں، علی گڑھ کی دعوت پر مدرسہ اول کی حیثیت سے دارالعلوم حافظیہ سعیدیہ میں ان کا تقرر ہوا۔ جہاں سات سال تک سخن و خوبی درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اس کے بعد ایک سال مظہر العلوم کچی باغ، بنارس میں بھی رہے پھر آخر کار ۱۹۴۵ء تک منظر اسلام بریلی میں درس دیا اور پوری زندگی درس و تدریس کی نظر ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے، جو ایک زمانہ میں حیدرآباد دکن میں صدر امور مذہبی رہ چکے تھے ۱۳۵۶ھ کے سالانہ جلسہ امتحان کے موقع پر اپنی تقریر میں مولانا امجد علی صاحب کی مہارتِ درس، اور تبحر علمی کا اعتراف کیا اور کہا کہ ”مولانا امجد علی صاحب پورے ملک میں ان چار پانچ مدرسین میں ایک ہیں جنہیں میں منتخب جانتا ہوں۔“ ۳۶

غرض کہ مولانا امجد علی صاحب مختلف درس گاہوں کے تجربہ کار عالم تھے۔

جدید ضرورتوں سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم کا بھی انہیں بخوبی تجربہ تھا اسی لیے فروری ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصاب کی تشکیل کے سلسلہ میں جن اہم مدرسین سے رابطہ قائم کیا گیا ان میں مولانا صاحب کا بھی نام تھا۔ ان کا شمار انکے دور کے اعلیٰ پایہ کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ درس کے لئے جن خوبیوں کو اہم مانا جاتا ہے وہ مولانا کا شعار زندگی بن گئی تھی۔ حدیث و تفسیر کے علاوہ مختلف علوم و فنون کا درس بھی اس طرح دیتے کہ طلباء بخوبی سمجھ جاتے۔

مولانا امجد علی صاحب جہاں ایک باکمال مدرس اور خطیب تھے وہیں اعلیٰ مرتبہ مصنف بھی تھے۔ ان کی زبان سادہ، سہل اردو روزمرہ تھی۔ انہوں نے اسلام کی خوب اشاعت کی اور اجمیر کے زمانہ قیام میں نو مسلم راہپوتوں میں تبلیغ کا کام بھی بخوبی انجام دیا۔

مولانا امجد علی صاحب کی تقریر خالص علمی مضامین اور قرآن و حدیث کی تفسیر و تفصیل پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ فقہی جزئیات نوک زبان پر رہتی تھی ان ہی خصوصیات کی بنا پر مولانا احمد رضا خاں نے ان کو "صدر الشریعہ" کا لقب دیا۔

اجمیر کے قرب و جوار میں راجہ پر تھوی راج کی اولاد تھی جو اگرچہ مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان میں فرائض و واجبات سے غفلت اور مشرکانہ رسوم بہت زیادہ پائی جاتی تھیں۔ مولانا امجد علی صاحب کے ایما پر ان کے شاگردوں نے ان میں تبلیغ کا پروگرام بنایا تبلیغی جلسوں کا خوشگوار اثر ہوا اور ان لوگوں میں مشرکانہ رسوم سے اجتناب اور دینی اقدار اپنانے کا جذبہ پیدا ہو گیا اس کے علاوہ ارد گرد کے بڑے شہروں اور قصبات مثلاً نصیر آباد، لاڈنوں، جے پور، جودھپور، پالی مارواڑ اور پتھوڑ وغیرہ میں بھی خود مولانا اور ان کے تلامذہ نے تبلیغی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں۔ مولانا کی تقریر ایسی جامع اور موثر ہوتی تھی کہ علماء اور مشائخ جھومتے اور داد تحسین دیتے تھے۔

تصنیف و تالیف :-

مولانا امجد علی صاحب ایک صاحب قلم ادیب تھے حالانکہ دوسری مصروفیات کے مقابلے میں تصنیف و تالیف کا کام بہت نہیں ہوا لیکن جو کچھ بھی کام کیا وہ ان کی علمی صلاحیت اور اردو دانی پر بین ثبوت ہیں۔ تلاش و تحقیق کے بعد ان کی جو تصنیفات دستیاب ہوئیں ان کی تعداد ۲۵ تک پہنچتی ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱)	حاشیہ شرح معانی الآثار	قلمی نسخہ	(عربی)
(۲)	فتاویٰ امجدیہ جلد اول	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۷۹ء۔	(اردو)
(۳)	فتاویٰ امجدیہ جلد دوم	مطبوعہ الہ آباد ۱۹۸۳ء۔	(اردو)
(۴)	اسلامی اخلاق و آداب	مطبوعہ اکتوبر ۱۹۸۶ء۔	(اردو)
(۵)	بہار شریعت	پہلا حصہ	(اردو)
(۶)	بہار شریعت	دوسرا حصہ	(اردو)
(۷)	بہار شریعت	تیسرا حصہ	(اردو)
(۸)	بہار شریعت	چوتھا حصہ	(اردو)
(۹)	بہار شریعت	پانچواں حصہ	(اردو)
(۱۰)	بہار شریعت	چھٹواں حصہ	(اردو)
(۱۱)	بہار شریعت	ساتواں حصہ	(اردو)
(۱۲)	بہار شریعت	آٹھواں حصہ	(اردو)
(۱۳)	بہار شریعت	نواں حصہ	(اردو)
(۱۴)	بہار شریعت	دسواں حصہ	(اردو)
(۱۵)	بہار شریعت	گیارہواں حصہ	(اردو)

(اردو)	بارہواں حصہ	(۱۶) بہار شریعت
(اردو)	تیرہواں حصہ	(۱۷) بہار شریعت
(اردو)	چودہواں حصہ	(۱۸) بہار شریعت
(اردو)	پندرہواں حصہ	(۱۹) بہار شریعت
(اردو)	سولہواں حصہ	(۲۰) بہار شریعت
(اردو)	سترہواں حصہ	(۲۱) بہار شریعت
(اردو)	اٹھارہواں حصہ	(۲۲) بہار شریعت
(اردو)	انیسواں حصہ	(۲۳) بہار شریعت
	بیسواں حصہ (اردو)	(۲۴) بہار شریعت
	(بچوں کے لیے)	(۲۵) اردو کا قاعدہ

حاشیہ شرح معانی الآثار :-

مولانا امجد علی اعظمی نے امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۱ھ) کی معرکتہ الآرا تصنیف "شرح معانی الآثار" پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا کثرتِ کار کے سبب یہ کام صرف پہلی جلد تک چل سکا مگر جتنا ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جلد اول کا نصف حاشیہ باریک قلم سے ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۳۵، ۳۶ سطریں ہیں قادری منزل میں دائرۃ المعارف الامجدیہ گھوسی کے دفتر میں اس حاشیہ کا قلمی نسخہ موجود ہے انہوں نے دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام کے دوران یہ حاشیہ عربی زبان میں لکھنا شروع کیا اور سات ماہ کی مختصر مدت میں نصف اول پر مبوط حاشیہ لکھ دیا۔

فتاویٰ امجدیہ :-

دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے یہ مصنف کے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جسے انہوں

نے < ربيع الاول ۱۳۴۰ھ سے لے کر ۸ شوال ۱۳۶۷ھ تک صادر کئے ہیں پہلی جلد کتاب الطہارت سے شروع ہو کر کتاب الحج پر ختم ہوتی ہے جو ۴۰۳ صفحات پر مشتمل ہے دوسری جلد ”کتاب النکاح“ سے شروع ہو کر ”حدود و تعزیر کا بیان“ پر ختم ہوتی ہے یہ ۳۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا امجد علی صاحب سے مختلف زبانوں میں لوگوں نے سوال کئے اور فتوے پوچھے انہوں نے سفر میں، حضر میں، وطن میں اور باہر ہر جگہ بے شمار فتوے لکھے اور بیان کئے ان کے بعض اہم حصے دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہے لیکن آخر میں انہوں نے ایک یا دو جلدیں خاص کر اپنے فتاویٰ کے لیے سفید کاغذ کی تیار کرائیں اور اس میں اپنے فتاویٰ اندراج کرائے اور ان فتاویٰ کی اکثر و بیشتر نقلیں مولانا سردار احمد (محدث پاکستان) کے ہاتھوں کی گئی ہیں۔ مولانا عبدالمنان کلہمی فاضل اشرفیہ مبارکپور نے ان کو فقہی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا اور مولانا مفتی شریف الحق صاحب نے ان فتوؤں پر اپنے مفید حواشی کا اضافہ کیا۔ مولانا امجد علی کے یہ فتاویٰ دلائل و ترجیحات و عبارات فقہیہ پر مشتمل ہیں۔ ان فتاویٰ کی زبان نہایت سادہ ہے اور کم الفاظ میں جامع کلام کے ساتھ زیادہ ابلاغ کہنے کی کوشش کی گئی ہے جس کو بہت سراہا گیا اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

بہار شریعت :-

مولانا امجد علی اعظمی کی وہ کتاب جو دوسرے مصنفین کی جملہ تصانیف پر بھاری ہے وہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ”بہار شریعت“ ہے اس کتاب کے سبب وہ زندہ جاوید ہوئے اس کتاب میں انہوں نے فقہ حنفی کو اردو قالب میں ڈھال کر وقت کی اہم

ضرورت کو پورا کیا ہے اس سے فائدہ حاصل کرنے والوں میں علماء، عوام دونوں شامل ہیں۔ مصنف فقہ اسلامی اور مسائل شرعیہ کو مکمل طور پر ہمیں جلدوں میں سمیٹنا چاہتے تھے مگر عمر نے ساتھ نہ دیا اور سترہ حصے لکھنے کے بعد دنیا تے دار فانی سے ۲ ذی قعدہ، ۶ ستمبر ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء۔ دو شنبہ کو ۱۲ بج کر ۶ منٹ پر انتقال کر گئے اور وصیت کر گئے کہ میری اولاد یا تلامذہ یا علمائے اہل سنت میں سے کوئی صاحب اس کا قلیل حصہ جو باقی رہ گیا ہے اس کو پورا کر دیں۔ چنانچہ ان کے شاگرد اور دیگر علماء بہار شریعت کے باقی تین حصے ۱۸، ۱۹، ۲۰ ضبط تحریر میں لاکھے ہیں جو چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ مصنف کی وصیت کے مطابق یہ خیال رکھا گیا ہے اور اس میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مسائل کے ماخذ کتب کے صفحات کے نمبر اور جلد نمبر بھی لکھ دیتے ہیں تاکہ اہل علم کو ماخذ تلاش کرنے میں آسانی ہو اکثر کتب فقہ کے حوالہ جات نقل کر دیتے ہیں جن پر آج کل فتویٰ کا مدار ہے حضرت مصنف کے طرز تحریر کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فقہی موشگافیوں اور فقہاء کے قلیل و قال کو چھوڑ کر صرف مفتی بہ یعنی جس پر فتویٰ ہے، اقوال کو سادہ اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔

بہار شریعت (حصہ ۱۸) :-

بہار شریعت (حصہ ۱۸) کے مصنف مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری ابن مولانا امجد علی، شیخ الحدیث، مولانا وقار الدین، نائب شیخ الحدیث و مولانا قاری محبوب رضا خاں بریلوی مفتی دارالعلوم امجدیہ کراچی ہیں۔ اس کا موضوع جنایات (خون بہا، قصاص، اکیڈنٹ وغیرہ) ہے۔ اس میں سنہ۔ طباعت کا ذکر نہیں ہے اور نہ مطبع کا ذکر ہے

البتہ ناشر کا نام قادری بک ڈپو، نو محلہ مسجد، بریلی ہے اس کتاب میں صفحات ۱۱۹ اور کل مسائل ۶۵۸ ہیں۔

بہار شریعت (۱۹ واں حصہ)۔

یہ حصہ مطبوعہ ہے اس کے مصنف مولانا امجد علی کے شاگرد مولانا سید ظہیر احمد زیدی ہیں۔ اس کتاب کے ۷۲ صفحات ہیں۔ ابتدائے کتاب میں مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری اور مولانا قاری رضا ^{لمصطفیٰ} کے تذکرے تحریر ہیں۔ اس کے بعد مؤلف کتاب بہار شریعت ۱۹، واں حصہ ظہیر احمد زیدی کا ایک تعارف مکرئی جناب ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم (بہمدرد یونیورسٹی تٹی دلی) نے تحریر فرمایا ہے جس میں مصنف سے متعلق اپنے تاثرات، تجربات، اور مشاہدات مختصر انداز میں بیان کئے ہیں پھر ایک مقدمہ ہے جسے مؤلف ہی نے قلمبند فرمایا ہے۔ مؤلف کی ص ۷۲ پر تحریر کے مطابق بہار شریعت ۱۹ واں حصہ کی تالیف مورخہ ۲۹ شوال ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ء یوم چہار شنبہ اختتام کو پہنچی۔ اس کتاب میں کل ۸ احادیث اور ۴۴۵ مسئلے ہیں وصایا کے مباحث پر یہ کتاب مشتمل ہے اس کا اختتام ذمی کی وصیت کے بیان پر ہوتا ہے۔

بہار شریعت (۲۰ واں حصہ)۔

مولانا امجد علی صاحب کے حسب وصیت اس حصہ کے مصنف مولانا وقار الدین مفتی و نائب شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ، کراچی ہیں۔ یہ مطبوعہ ہے اس کے ۶۴ صفحات ہیں۔ یہ حصہ وراثت کے بیان میں ہے مسائل بیان کرنے سے پہلے بسلسلہ وراثت آیات قرآنی اور ۱۷ احادیث مذکور ہیں تقریباً اس میں ۷۲ مسائل کا بیان

ہے۔ ان سب کے ناشر کا نام قادری بک ڈپو نو محلہ مسجد، بریلی ہے۔ ان میں سنہ طباعت اور مطبع کا ذکر نہیں ہے۔

مولانا امجد علی صاحب کی بہار شریعت کا سترہ حصوں کا تجزیہ اس طرح ہے
بہار شریعت پہلا حصہ :-

اس حصہ میں عقائد سے متعلق مباحث ہیں۔ کتاب میں ۱۲۳ عقیدے بیان کئے گئے ہیں۔ جن مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ان کی تعداد ۱۲۵ ہے اہم عقیدوں کی سرخیاں اس طرح ہیں۔

ذات و صفات باری تعالیٰ، عقائد نبوت، ملائکہ، جن، جنت و دوزخ، ایمان و کفر، امامت و ولایت، عالم برزخ اور معاد و محشر، وغیرہ۔ جہاں مصنف نے معاد و محشر کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے اس کے ضمن میں ۲۸ نشانیاں شمار کرائی ہیں۔

بہار شریعت دو سہرا حصہ :-

یہ کتاب، کتاب الطہارت کے ابواب و فصول پر مشتمل ہے اس میں ۱۸۹ احادیث اور ۲۶۲ مسائل کا ذکر ہے۔ وضو، غسل، تیمم، حیض، نفاس، استحاضہ، موزوں پر مسح، نجاستوں اور استنجا کے بیان اس کے مباحث ہیں۔

اس حصہ کی تکمیل غالباً ۱۳۳۵ھ میں ہوئی اس کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے جو حقہ سے متعلق کئے گئے اعتراضات کا جواب ہے جس کے آخر میں اس دور کے جلیل القدر علماء کی تصدیقات بھی ہیں۔

بہار شریعت تیسرا حصہ :-

نماز جیسی اہم عبادت سے شروع ہو کر احکام مسجد کے بیان پر ختم ہوتی ہے اس میں کل ۳۴۲ احادیث اور ۸۴۲ مسائل ہیں۔ اس کے اہم مباحث اس طرح ہیں۔ نماز، وقت نماز، اذان، شرائط نماز، طریقہ نماز، مسئلہ درود، بعد نماز ذکر و دعا، تلاوت قرآن مجید، قرأت میں غلطی، امامت، جماعت، مکروہات اور احکام مسجد وغیرہ، کتاب کے آخر میں مولانا احمد رضا بریلوی کی تقریظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب رمضان ۱۳۳۷ء میں مکمل ہوئی۔

بہار شریعت چوتھا حصہ :-

اس کتاب میں وتر کا بیان، وتر کے فضائل، سنن و نوافل کا بیان، نماز استحار، تراویح کا بیان، قضا نماز کا بیان، سجدہ۔ سہو، سجدہ۔ تلاوت، نماز مسافر، نماز مریض، جمعہ، نماز عیدین، نماز استسقاء، نماز خوف، کتاب الجنازہ، بیماری کا بیان، قبر و دفن، تعزیت، شہید کا بیان وغیرہ جیسے اہم مسائل درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں کل ۱۷۶ احادیث اور ۸۱۰ مسائل کا ذکر ہے ۱۳۳۷ء میں غالباً یہ حصہ بھی تکمیل پہنچی ہے۔

بہار شریعت پانچواں حصہ :-

اس کتاب کی ابتدا زکوٰۃ کے مسائل سے ہوتی ہے اور مسائل اعتکاف پر اس کا اختتام ہوتا ہے اس میں ۲۵۳ احادیث اور ۵۳۰ مسائل ہیں۔

بہار شریعت چھٹواں حصہ :-

اس حصہ میں ۱۱۵ احادیث اور ۴۷۵ مسائل ہیں یہ حصہ حج کے فضائل و مناسک پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حج کے جن مسائل کی سرخی قائم کی گئی ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے۔ حج کا بیان، میقات کا بیان، احرام کا بیان، داخلہ حرم محترم و مکہ مکرمہ و مسجد الحرام، طواف و سعی صفا و مروہ و عمرہ کا بیان، منیٰ کی روانگی اور عرفہ کا وقوف، مزدلفہ کی روانگی اور اس کا وقوف، منیٰ کے اعمال اور حج کے بقیہ افعال، قرآن کا بیان، تمتع کا بیان، جرم اور ان کے کفارے کا بیان، محصر کا بیان، حج فوت ہونے کا بیان، حج بدل کا ہین، حج کی منت کا بیان، فضائل مدینہ طیبہ۔

بہار شریعت ساتواں حصہ :-

یہ حصہ نکاح کے مسائل پر مشتمل ہے اس میں ۴۸ احادیث اور ۴۱۸ مسائل کا ذکر ہے اس کے اہم موضوعات اس طرح ہیں۔ نکاح کا بیان، محرمات کا بیان، دودھ کے رشتے کا بیان، دلی کا بیان، کفو کا بیان، نکاح کی وکالت کا بیان، لونڈی غلام کے نکاح کا بیان، نکاح کافر کا بیان، باری مقرر کرنے کا بیان، حقوق الزوجین، ثنادی کے رسوم۔

بہار شریعت آٹھواں حصہ :-

یہ کتاب ۲۱ احادیث اور ۴۲۷ مسائل پر مشتمل ہے اس میں طلاق کے مسائل مع کلیات و جزئیات بیان کئے گئے ہیں اس کی تکمیل ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۳۸ھ کو ہوئی اس میں مندرجہ ذیل مسائل کو دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ طلاق کا بیان، صریح کا بیان، اضافت کا بیان، غیر مدخولہ کی طلاق کا بیان، کنایہ

کابیان، تعلق کابیان، استثناء۔ کابیان، طلاق مریض کابیان، رجعت کابیان، ایلا کابیان، خلع کابیان، کفارہ کابیان، نفقہ کابیان، یہ اس کتاب کی اہم سرخیاں ہیں اس کے ضمن میں اس کے متعلقہ مسائل کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا اختتام جس مسئلہ پر ہوتا ہے وہ جانور پر بوجھ لادنے سے متعلق ہے۔

بہار شریعت نواں حصہ :-

اس حصہ میں درج ذیل مسائل پر گفتگو کی گئی ہے

آزاد کرنے کابیان، مدبر و مکاتب و ام و ود کابیان، قسم کابیان، قسم کے کفارہ کابیان، منت کابیان، مکان میں رہنے اور جانے سے متعلق قسم کابیان، کھانے پینے کی قسم کابیان، کلام کے متعلق قسم کابیان، طلاق دینے اور آزاد کرنے کی یمن، خرید و فروخت و نکاح وغیرہ کی تقسیم، نماز و روزہ و حج کی قسم کابیان، لباس کے متعلق قسم کابیان، حدود کابیان، کہاں حد واجب ہے کہاں نہیں، زنا کی گواہی دے کر رجوع کرنا، شراب پینے کی حد کابیان، راہزنی کابیان، حد قذف کابیان، تعزیر کابیان، چوری کی حد کابیان، ہاتھ کاٹنے کابیان، کتاب السیر، غنیمت کابیان، غنیمت کی تقسیم کابیان، استیلائے کفار کابیان، مستامن کابیان، عشر و خراج کابیان، جزیہ کابیان، مرتد کابیان۔

اس میں کل ۱۱۸ احادیث اور ۶۵۶ مسائل ہیں اس کی تکمیل ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۴۸ھ میں ہوئی۔

بہار شریعت دسواں حصہ :-

اس حصہ کی تکمیل ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ کو ہوئی۔ اس میں ۱۲۵

احادیث اور ۵۶۱ مسائل کا ذکر ہے اس کی ابتدا لفظ کے بیان سے ہوتی ہے اور اختتام وقف مریض پر ہے اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مباحث اس میں ہیں۔

لقیظ کا بیان، مقصود کا بیان، شرکت فاسدہ کا بیان، شرکت کا بیان، وقف کا بیان، کس چیز کا وقف صحیح ہے، مصارف وقف کا بیان، اولاد یا اپنی ذات پر وقف کا بیان، مسجد کا بیان، قبرستان وغیرہ کا بیان، وقف میں شرائط کا بیان، تولیت کا بیان، اوقاف کے اجارہ کا بیان، دعویٰ اور شہادت کا بیان۔

بہار شریعت گیارہواں حصہ :-

اس حصہ میں ۹۶ احادیث اور ۶۶۷ مسائل ہیں۔ خرید و فروخت کے بیان سے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا اختتام بیع صرف کے مسئلہ پر ہوتا ہے اس کے علاوہ کتاب کی درج ذیل سرخیاں اہم ہیں۔

خيار شرط کا بیان، خيار عيب کا بیان، بیع فاسد کا بیان، بیع مکروہ کا بیان، اقالہ کا بیان، راجحہ و تولیہ کا بیان، بیع و ثمن میں تصرف کا بیان، قرض کا بیان، سود کا بیان، حقوق کا بیان، استحقاق کا بیان، بیع سلم کا بیان، استصناع کا بیان، بیع صرف کا بیان۔

بہار شریعت بارہواں حصہ :-

اس حصہ میں ۴۱ احادیث اور ۵۶۸ مسائل ہیں شروع کتاب میں کفالت کی اصطلاحی تعریف ہے اس کے بعد کفالت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں پھر بالترتیب درج ذیل موضوعات پر عالمانہ سنجیدہ گفتگو ہے۔

حوالہ کا بیان، قضا کا بیان، انکار کے مسائل، تحکیم کا بیان، گواہی کا بیان،

شہادت میں اختلاف کا بیان، شہادت علی الشہادت کا بیان، گواہی سے رجوع کرنے کا بیان، وکالت کا بیان، خرید و فروخت میں توکیل کا بیان، وکیل بالخصومت اور وکیل بالقبض کا بیان، وکیل کو معزول کرنے کا بیان۔

بہار شریعت تیسرا ہواں حصہ :-

اس کا آغاز "دعویٰ کا بیان" سے ہوتا ہے اس میں ۱۲ احادیث اور ۶۰۰ مسائل ہیں اس کے دوسرے موضوعات یہ ہیں۔

حلف کا بیان، تحائف کا بیان، دعویٰ دفع کرنے کا بیان، دو شخصوں کے دعویٰ کرنے کا بیان، دعوائے نسب کا بیان، اقرار کا بیان، استثناء اور اس کے متعلقات کا بیان، نکاح و طلاق کا اقرار، وصی کا اقرار، اقرار مریض کا بیان، اقرار نسب، صلح کا بیان، دعوائے دین میں صلح کا بیان، تخارج کا بیان، غصب و سہ قہ و اکراه میں صلح، کان کرنے والوں میں صلح، بیع میں صلح، صلح میں خیار، جاتداد غیر مستثنیٰ میں صلح، یمین کے متعلق صلح وغیرہ۔

اس کتاب کے آخر میں صلح سے متعلق کچھ احادیث اور آیات ہیں جو شاید درمیان کتاب میں صلح کا موضوع پر لکھنے سے رہ گئے تھے۔

بہار شریعت چودہواں حصہ :-

اس حصہ میں ۲۴ احادیث اور ۳۲ مسائل ہیں مندرجہ ذیل موضوعات پر اس کتاب میں تفصیلی بحث ہے۔

مضاربت کا بیان، ودیعت کا بیان، عاریت کا بیان، ہبہ کا بیان، ہبہ واپس لینے کا بیان، اجارہ کا بیان، دایہ کے اجارہ کا بیان، اجارہ فاسدہ کا بیان، ضمان اجیر کا

بیان، اجارہ فسخ کرنے کا بیان، ولا کا بیان۔

بہار شریعت پذیر، ہواں حصہ :-

اس حصہ میں ۸۴ احادیث اور ۶۶۵ مسائل ہیں اکراہ کے بیان سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ حج، بلوغ، ماذون، غضب، مغضوب چیز میں تغیر، طلب شفعہ، شفعہ کے مراتب، شفعہ باطل ہونے کی وجہ، تقسیم مہایاۃ، مزارعت، معاملہ، ذبح، حلال و حرام جانور، قربانی، عقیقہ، قربانی کے جانوروں کا بیان، اس کتاب کے دوسرے موضوعات ہیں۔

بہار شریعت سولہواں حصہ :-

اس حصہ میں ۸۲۶ احادیث اور ۵۴۴ مسائل ہیں اس کتاب میں جن مسائل کو موضوع قلم بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

حظر و اباحت، پانی پینے کا بیان، ولیمہ، ضیافت، ظروف، خبر کہاں معتبر ہے، لباس، عمامہ، جوتا، انگوٹھی اور زیور کا بیان، برتن چھپانے اور سونے کے وقت کے آداب، بیٹھنے، سونے اور چلنے کے آداب، دیکھنے اور چھونے کا بیان، مکان میں جانے کے لیے اجازت لینا، سلام، مضامحہ، معانقہ، چھینک اور جمائی، خرید و فروخت کا بیان، آداب مسجد و قبلہ، قرآن مجید پڑھنے کے فضائل، عیادت، علان، ہوا و لعب، اشعار، جھوٹ، بغض و حسد، غصہ و تکبر، سلوک کا بیان، ہجر و قطع تعلق کی ممانعت، پڑوسیوں کے حقوق، اللہ کے لیے دوستی و دشمنی، حجامت ہوانے و ناخن ترشوانے کا بیان، ختنہ، زینت، مسابقت کسب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ریا و سمعہ، اور زیارت قبور کا بیان، ایصالِ ثواب مجانس خیر، آداب سفر وغیرہ۔

بہار شریعت ستر، ہواں حصہ :-

تحریر کے بیان سے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے اس میں ۲۹ احادیث اور ۳۶۰ مسائل ہیں اس حصہ کی تکمیل ۱ ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ میں ہوئی یہ مصنف کی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے اس میں درج ذیل مباحث کا ذکر ہے۔

احیاء۔ اموات، شراب و اشربہ، شکار، جانوروں سے شکار، زمین، شتی مرہون کے مصارف کا بیان، مرہون میں تصرف، کس چیز کو رہن رکھ سکتے ہیں، باپ یا وصی کا نابالغ کی رہن رکھنا، رہن میں جنایات کا بیان، کہاں قصاص واجب ہوتا ہے، اطراف میں قصاص کا بیان۔

مصنف نے بہار شریعت میں اعتماد و یقین کے ساتھ مسائل بیان کئے ہیں اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مسائل کا جس انداز سے احاطہ کیا ہے بلاشبہ وہ انہیں کا حصہ ہے۔ سارے بیان کئے ہوئے مسائل کی نشاندہی اور پھر اس کا تجزیہ کرنا اور دلائل اور لب و لہجہ کے اعتبار سے اس کی اہمیت واضح کرنا وقت طلب کے ساتھ ساتھ وقت طلب بھی ہے مگر مصنف نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ مثلاً مصنف نے ظہارت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کتاب میں جگہ جگہ آب مطلق اور آب مقید سے بحث کی ہے (انہوں نے اس کے ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ حقہ کا پانی پاک ہے۔ اگرچہ رنگ و بومزہ میں تغیر آجائے اس سے وضو جائز ہے بقدر کفایت اس کے ہوتے ہوئے تیمم جائز نہیں)۔

اسلامی اخلاق و آداب :-

مولانا امجد علی اعظمی کی یہ تصنیف اسلامی اخلاق و آداب پر ایک بہترین کتاب

ہے جو مسلم معاشرہ کے لیے لائحہ عمل ہے۔ یہ مجموعی اعتبار سے ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت زرق الماسی قادری رامپوری نے کی ہے۔ جدید ترتیب، تصحیح، تعلق، تقدیم مولانا محمد احمد مصباحی بھیروی استاد عربی جامعہ اشرفیہ مبارکپور کی ہے۔ یہ کتاب اکتوبر ۱۹۸۶ء میں دو ہزار چھپی تھی۔ ناشرانہ مجمع الاسلامی فیض العلوم محمد آباد گوہنہ ہے۔

ان تمام اخلاقی و آدابی مسائل کو احادیث کی روشنی میں بیان کیا ہے اس کی زبان سہل، سادہ اور عام فہم ہے احادیث کے اردو ترجمے پیش کئے گئے ہیں۔ کھانے سے متعلق ۶۵ احادیث ہیں اس کے علاوہ باقی مختلف موضوعات پر کل ۸۰۶ احادیث کریمہ درج ہیں۔ اسلوب بیان دلکش، سادہ اور اردو زبان عام بول چال سے بالکل قریب ہے۔

مولانا امجد علی صاحب کے یہ تصنیفی کارنامے دنیا تے اردو ادب میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اور اردو کے سرمائے میں بلاشبہ ایک اضافہ ہیں۔ ان کے ان کارناموں کی بدولت انہیں اردو کا ایک ممتاز ادیب کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

(۹)

<http://t.me/Tehqiqat>

مولانا سید محمد سلیمان اشرف بہاری

سید محمد سلیمان اشرف نام تھا ان کے والد ماجد حکیم سید محمد عبداللہ طریقت و شریعت کے ایک بزرگ اور درویش منش انسان تھے۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز دیہات میرداد قصبہ بہار

(پٹنہ) میں سید گھرانے کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ کم عمری میں ان کو مولانا محمد احسن ستخانوی کی سرپرستی میں دے دیا گیا ان سے چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لئے مدرس ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے لیکن یہاں زیادہ دنوں تک رک نہ سکے اور جلد ہی مولانا محمد ہدایت اللہ خاں جونپوری (م ۱۹۰۸ء) کے مدرسہ حنفیہ میں داخلہ لے کر انہوں نے اسلامی علوم اور منطق و فلسفہ کی آخری کتابیں ختم کیں اور استاد کی حیات تک یہیں مقیم رہے۔ اس کے علاوہ مولانا یار محمد بندیا لوی سے بھی استفادہ علمی کیا۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف کو اپنے استاد مولانا محمد ہدایت اللہ خاں جونپوری سے بے حد محبت و عقیدت تھی سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:-

”مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ ان کے حالات جب کبھی وہ وہ سناتے تو ان کے طرز بیان اور گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی۔“ ۳۷

اپنے استاد کے علاوہ مولانا شاہ احمد رضا بریلوی سے بھی انہیں خاص عقیدت تھی وہ ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔

مولانا سید سلیمان اشرف بڑی جامع اور متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں خودداری اور عزت نفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آوازیں بڑا رعب اور جلال تھا۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی گیا کے بہار نمبر ”ندیم“ میں لکھتے ہیں ”مولانا سلیمان اشرف بڑے طنطنہ کی شخصیت تھے“ شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہ و باوقار شخصیت کے مالک تھے بقول سید سلیمان ندوی کے

”آپ سلیمانوں میں نامور اور برتر تھے۔“ ۳۸

مولانا خوددار اور اپنے مسلک میں سخت مزاج ضرور تھے لیکن ان میں بد کرداری نہیں تھی چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں:-

”مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلور رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلا کھلم ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا خانقاہ سلیمانہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابو بکر صاحب، محمد مقتدی خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سعید زین الدین صاحب تھے، - باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہار الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔ مولانا ابو بکر (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) کے بڑے مداح تھے ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی بے نظیر نکلا۔“ ۳۹

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب ایک بڑے خطیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا بریلوی نے جمعیت علما کے جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلہ میں ان کو مدعو کیا تھا ان کی تقریر کو خود آزاد صاحب نے سراہا اور داد دی۔

۱۹۰۲ء میں جب مولانا سید سلیمان اشرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے چیرمین مقرر ہوئے تو انٹرویو میں ایک مقالہ ”معجزہ“ لکھنے کو کہا گیا اور ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ کتابوں کے مطالعے کی ضرورت ہو تو حبیب گنج چلے جائیں مولانا نے کہا کہ بھگواند مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت

ہے چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد سے صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں باتیں فل اسکیپ صفحات پر مدلل مضمون قلمبند کر دیا جو بہت پسند کیا گیا پھر جمعہ کی نماز کے بعد "توحید" پر خطاب کرنے کے لیے کہا گیا تو مولانا نے تین گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر فرمائی جو سامعین کے لیے مؤثر ثابت ہوئی۔ اس تقریر میں دینیات کمیٹی کے تمام اراکین، نواب وقار الملک، مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمن شروانی موجود تھے اسی دن پچاس روپے مشاہرہ پر مولانا سلیمان اشرف کی تقریر کر دی گئی۔ انہوں نے مرتے دم تک بحسن و خوبی اپنے منصبی فرائض انجام دیتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں ہزاروں افراد کو علم و فضل سے سیراب کیا۔ ان کے شاگردوں میں فضل الرحمن انصاری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ بہت اہم ہیں۔

درس و تدریس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر دن نماز عصر کے بعد قرآن پاک کا درس دیتے تھے وہ بڑے نادر نکتے بیان کرتے قاری محمد انوار انہیں قلمبند کر لیتے تھے۔ مولانا سید محمد سلیمان اشرف نہ صرف بہترین معلم تھے بلکہ ایک سلجھے ہوئے ماہر تعلیم بھی تھے۔ ۱۹۲۵-۲۶ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے میٹرک سے لے کر ایم۔ اے تک کی دینیات کی جماعتوں کے لیے ایک نئے نصاب کے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کمیٹی میں مولانا حبیب لارحمان خاں شروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا امجد علی جیسی شخصیات کے ساتھ سید سلیمان اشرف کو بھی شامل کیا گیا۔

مولانا سید محمد سلیمان اشرف برصغیر کے ان ممتاز علماء کی صف میں نظر آتے ہیں جنہیں خدائے بزرگ نے سیاسی بصیرت سے نوازا تھا اور جن کا دل ملت کی فکری بیداری اور ان کے روشن مستقبل کے لیے آشنائے درد تھا اس ضمن میں انہوں نے بھی اپنے کرب آگہی کی داستان اردو زبان اور اسلامی ادب کے سانچے میں پیش کی ہے۔ ان

کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ان کی تصنیف النور، البلاغ، اور الرشاد کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ جن علمائے کے سیاسی رجحانات اور ان کی کارکردگی نے برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے ان میں سید سلیمان اشرف کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ جنہوں نے ملک کی آزادی اور ملی بیداری کے لیے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بھرپور کوشش کی۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے نہ صرف فکری بلکہ عملی جہاد کر کے مسلمان قوم کو اسلامی درگاہوں کو بچانے کی بھرپور کوشش کی اس کوشش میں اکثر ان کی جھڑپ مولانا محمد علی سے ہو جاتی اور گرم بحث و مباحثہ چلتا رہتا۔ اس سلسلہ میں وہ سرسید کے ہم خیال تھے ڈاکٹر عبدالباری کے بقول۔

”آپ (مولانا سید سلیمان اشرف) کی تحریروں میں سرسید کے تعلیمی مشن اور اصلاح ملت و معاشرہ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔“

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سرپرستی اور مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں چلنے والی تحریک خلافت ہندوستان کی ایسی ہنگامہ خیز عوامی تحریک تھی جس نے کشمیر سے کنیا کماری تک اور ہندوستان کے طول و عرض میں مسلم جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے بعد پہلی بار اس تحریک نے مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا شعور بخشنا اور خلافت کے نام پر مرٹنے کا ارمان ان کے سینوں میں انگڑائیاں لینے لگا۔

لیکن ۱۹۱۹ء میں چلائی گئی یہ تحریک محض جذبات کی بنیاد پر اٹھی تھی اور اس کی کوئی فکری اساس و بنیاد نہ تھی اس لیے دو تین دالوں کے اندر اندر اسے عبرت ناک ناکامی سے دو چار ہونا پڑا اور ۱۹۲۲ء میں اس تحریک کی کمر اس وقت اور ٹوٹ گئی جب مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا اعلان کر کے اختیار اور اقتدار

کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا بلکہ اس سے پہلے ہی بڑی ذہانت اور منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گاندھی اور ولسن لیڈروں نے اسے تحریک ترک موالات (نان کو آپریشن موومنٹ) میں تبدیل کر کے اس کی ہیئت ترکیبی ہی کے اندر سیاسی آمیزش کر ڈالی تھی اور ایک دینی تحریک کو سیاسی تحریک کا رنگ دے دیا تھا۔

مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا مفتی مظہر اللہ دہلوی اور مولانا سید محمد سلیمان اشرف وغیرہ نے یہ بتانے کی ہمتی کی کہ یہ خلافت شرعی خلافت نہیں ہے اور اپنی ناتوانی و بے سروسامانی کے سبب ہم ترکی یا عرب جا کر خلافت قائم کرنے کے شرعاً مکلف نہیں، رہ گئی بات ترکوں کی تو صرف ترک ہی کیا بلکہ دنیا کے ہر مسلمان کی ممکن امداد و اعانت دنیا کے ہر مسلمان پر فرض ہے اس لیے جو کام اپنی استطاعت کے اندر ہے صرف اسی کو انجام دیا جانا چاہیے اور ساری قوم کو جذبات کے سیلاب میں بہا کر مشکلات و مصائب کا شکار بنا دینا خیر خواہی اسلام و مسلمین کے بالکل خلاف ہے مگر تحریک خلافت کے قائدین اور اکثر مسلمانوں نے اس وقت ان کی بات نہیں سنی اور قومی لیڈروں کے شور و غوغا میں ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ اس زمانے کے ایک عینی شاہد نواب مشتاق احمد خان لکھتے ہیں:-

”ان تین چار ہنگاموں کے بعد مسلمان یہ عام طور پر محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا ہی نقصان کیا۔ علی گڑھ میں تعلیمی سال کی بربادی ہوئی۔ نظم و ضبط متاثر ہوا اور اس سارے دور میں بنارس ہندو یونیورسٹی پر کوئی آنچ نہ آئی۔۔۔۔۔ علی گڑھ قربانی کا بکر بنایا۔“

اس زمانہ میں جمعیتہ العلماء (ہند) کے رہنماؤں نے بریلی میں ایک جلسہ منعقد کرنے

کا پروگرام بنایا تاکہ عدم تعاون کے مخالف گروہ اور حقوق اسلامی کے محافظ گروہ کا زور توڑا جاسکے اور اس سلسلہ میں دو اشتہار ایک "آفتاب صداقت" کے عنوان سے اور دوسرا "بنام" زندگی مستعار کی چند ساعتیں "شائع کئے۔ جمعیت علماء ہند کے مخالف گروہ نے، جو اس نظریے سے مستفق نہیں تھا، مقابلہ کی تیاری کا آغاز کر دیا اور علی گڑھ سے مولانا سید سلیمان اشرف کو خصوصاً دعوت اس لیے دی گئی کہ وہ اس مسئلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد سے بات چیت یا ضرورت ہو تو مناظرہ کر سکیں۔ مولانا ۱۳ رجب کو بریلی پہنچے اور جلسہ کی کارروائی میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مولانا سید سلیمان اشرف کو صدر جلسہ (بریلی) مولانا ابوالکلام آزاد نے ۳۵ منٹ تقریر کرنے کا وقت دیا۔ انہوں نے اس خوبی سے تقریر کی کہ اپنے اعتراضات بھی پیش کر دیئے اور ان کی غلطیاں بھی دکھائیں۔ مولانا کی تقریر میں قربانی ترک کرنے، شعا تر اسلام کو چھوڑنے اور شعا تر کفر میں مبتلا ہونے کا تذکرہ تھا۔ ان کی یہ تقریر بڑی مفصل تھی جو اسی زمانہ میں اراکین جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی نے "رواداد مناظرہ" میں شائع کرادی۔

۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک اور تحریک خلافت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی وغیرہ کا تھا اور دوسرا گروہ محمد علی جناح کا۔ بریلوی علماء آزاد صاحب کے گروہ کے نظریے کے مخالف تھے تاکہ ان علماء میں مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری کے نام نمایاں ہیں۔ محمد رضا نصاریٰ فرنگی محلی کے لفظوں میں:-

"۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک شروع ہو کر زور رو شور سے چل رہی تھی کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء ہند مشترکہ طور پر اس مہم میں شریک تھیں مسلمانوں کا ایک گروہ جو ایک خاص مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اس تحریک

کے خلاف تھا۔ مخالفت کا ایک خاص مرکز بریلی (یو۔ پی) تھا، جہاں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اس تحریک کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ دے چکے تھے جمعیتہ العلماء ہند کا ایک جلسہ اس تحریک ترک موالات کی تبلیغ کے سلسلے میں بریلی میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی "۴۲"

مولانا سید محمد سلیمان اشرف کی بعض تصانیف میں ان تمام سیاسی امور کا ذکر ہے جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا خلافت کا جھگڑا ہو یا ترک موالات کا، مسلمانوں کی تعلیمی تنزلی کا مسئلہ ہو یا ان سے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا ان سب پر ان کی گہری نظر تھی۔ قوم کے لیے کس حال میں بہتر کیا ہو گا اس کا انہیں بخوبی انداز تھا لہذا اپنی کتاب النور میں رقمطراز ہیں

"جس قوم کے پاس نہ دولت نہ ہو نہ اخلاق نہ ہو نہ علم نہ ہو نہ تدین ایسی گری ہوئی مردہ قوم کے سامنے وہ پیش کرنا جو کسی زندہ قوم کے لیے سزاوار تھا خیر خواہی نہیں بلکہ بد خواہی ہے۔" "۴۳"

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کا زمانہ خلافت تحریک کا شباب کا زمانہ تھا اس تحریک کے بارے میں سید سلیمان اشرف تحریر فرماتے ہیں:-

"جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنہگار کی زبان کلمہ حق کہہ رہی تھی جس وقت سارے اقلام خاموش تھے، مجھ بے بضاعت کا قلم مصرف تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں متزلزل میں تھے منزل رساں راستہ پر تھا، انصاف کرو اس میں میری کیا خطا ہوئی یہ تو اللہ کا فضل تھا، تم ہلالا احمر کے نام سے چندہ تحصیل کرتے تھے اور داد نشاط و عیش دیتے تھے۔ زرکشی

کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم انہی کو لکھتے، انہی کو کہتے تھے لیکن اس فقیر کو خلافت کی لو لگی تھی اس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ پھر ان کی خلافت ان کی اطاعت اور ان کے حقوق دلیل و بریان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ” ۴۴

اس دوران مولا سنانے مسلمانوں کی فکری بے راہ روی پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے یہ رباعی تحریر فرمائی ہے

دادم دلکے غمیں، بیا مرز مپرس
 صد واقعہ در کھیں، بیا مرز مپرس
 شرمندہ شوم اگر پرسی معلم
 یا اکرم الاکرمیں، بیا مرز مپرس ۴۵

خلافت عثمانیہ اپنے زمانہ عروج میں ان علاقوں پر حکمراں تھی، بحر قزوین، خلیج فارس، بحر روم، بحر اسود، اناطولیہ، انگورا، قسطنطنیہ، سلیمیا، دمشق، بیروت، بیت المقدس، بصرہ، بغداد، مقدونیا، البانہ، طرابلس، اسکندریہ، کربلا، موصل، حرین شریفین، بحر قلزم، طائف، صنعاء، یمن، عدن، مسقط وغیرہ اس عروج کے بعد زوال ہوا جس کی ایک جھلک مولانا سید سلیمان اشرف یوں بیان فرماتے ہیں:-

” اٹلی حملہ آور ہوا، جنگ طرابلس شروع ہوئی، نوجوانوں نے چندہ کی بنیاد ڈالی، جو جنگ بلقان تک جاری رہی اس عرصہ میں اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا حتیٰ کہ ترکی ٹوپیاں، جو ترکوں کا نشان تھیں لیکن اٹلی سے بن کر آتی تھیں، سربراہ جلا دی گئیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جب ہندوستانی فوجیں اس جنگ میں ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجی جانے لگیں تو کسی نے کچھ نہ کہا بلکہ مسٹر گاندھی نے فوجوں کو بھیجنے اور سپاہی بھرتی کرانے میں بڑی جدوجہد کی۔ حتیٰ کہ ان کی صحت خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئی۔ ”۴۶“

اسی کش مکش کے دور میں جبکہ کالجوں کے الحاق کرنے اور ان کی امداد ترک کرنے کے بحث چھڑی تھی مدن موہن مالویہ جی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے چندہ کی وصولی کے لیے بمبئی کا دورہ کیا اور خوب خوب پیسہ وصول کیا ان کی اس کامیابی کا ذکر مولانا سلیمان اشرف یوں کرتے ہیں:-

” انہیں ایام جب کہ کالجوں کے الحاق و ترک امداد مالی کا مسئلہ اٹھایا گیا پنڈت مالویہ جی ایک ہفتہ کے لیے بمبئی کا سفر کرتے ہیں اور سات دن میں اس قدر روپیہ لے آتے ہیں جس قدر مسلمانوں کا کل سرمایہ یونیورسٹی ہے ”۴۷“

اس کے علاوہ انہوں نے انور میں ان تمام سیاسی سرگرمیوں اور فرنگی حالوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے سبب ہم وطن آپس میں لڑ رہے تھے۔

تصنیف و تالیف:-

سید سلیمان اشرف صاحب مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات سے ۳۰ سال تک وابستہ رہے اور اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے ان کی تقریباً ۹ کتابیں ملتی ہیں جو حسب ذیل ہیں

- (۱) المبين مطبوعہ علی گڑھ (اردو)
- (۲) الحج مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء (اردو)
- (۳) امتاع النظر پر حاشیہ و تصحیح، مطبوعہ (اردو)
- (۴) القدر مطبوعہ (اردو)
- (۵) الانہار مطبوعہ (اردو)
- (۶) البلاغ مطبوعہ (اردو)
- (۷) سبیل الرشاد مطبوعہ (اردو)
- (۸) النور مطبوعہ (اردو)
- (۹) الخطاب مطبوعہ (اردو)

فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں "الانہار" تصنیف کی جس کے بارے میں فارسی و عربی اور اردو کے محقق و ادیب مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اسے شبلی کے شعرا لعمم سے بہتر قرار دیا۔

۴۸

الحج، حج کے موقع پر تالیف کی اس رسالہ میں حج و زیارت کے تمام ضروری مسائل نہایت سہل زبان و دل نشیں ترتیب میں بیان کئے گئے ہیں اور مقامات حج کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے مسائل بھی قلمبند کئے گئے ہیں اس میں مستند فقہ کی کتابوں کی اصل عبارتیں حوالہ کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں ان عبارتوں اور دعاؤں کا سلسلے ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مولانا کا طرز تحریر اور اسلوب بیان کا اندازہ ان کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے۔

"مکہ معظمہ میں شاید ہی کوئی ایسا مکان ہو جس میں کبوتر نہ رہتا ہو۔ خبردار ہرگز ہرگز انہیں نہ اڑاتے، نہ ڈراتے، نہ کسی طرح اس

ایذا پہنچائے۔ سلف سے یہ منقول ہے کہ یہ کبوتر اس مبارک جوڑے کی نسل سے ہیں جس نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت غار ثور میں انڈے دیئے تھے۔ اللہ عزوجل نے اس خدمت کے صلہ میں ان کو اپنے حرم پاک میں جگہ بخشی یہ روایت حرم کے کبوتر کی محبت اور کشش قلبی مومن کے دل میں پیدا کرتی ہے۔ "۹"

النور اور سبیل الرشاد میں مولانا نے تحریک خلافت کے لیڈروں کے خلاف شرع اقوال و افعال پر تنقید کی ہے ان میں انہوں نے سہل، سادہ اور عام فہم اردو زبان کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تصنیف "انتاع النظیر" کو اپنے حاشیہ اور تصحیح کے ساتھ پہلی دفعہ شائع کیا خیر آبادی کی یہ تصنیف فارسی زبان مجہیں ہے جس کو مولوی حیدر علی رام پوری کے اقوال کی تردید میں تحریر کیا۔ سلیمان اشرف کی تصنیفات میں مقبول ترین تصنیف "المبین" ہے جس کے تفصیلی جائزہ حسب ذیل یہ ہے۔

المبین:-

یہ سات ابواب پر مشتمل ہے ان میں حرف کی بحث سے لے کر کمال گویائی تک تمام مدارج و منازل اور عربی زبان کی فضیلت و عظمت اس خوبی سے بیان کی گئی ہے کہ ہر پڑھنے والا محو حیرت رہ جاتا ہے۔ علم اصول لغت، فلسفہ اور منطق، تعمق نظر اور قوت بحث سے حقائق کو واضح اور منکشف کیا گیا ہے حرف سے لے کر معانی کے فلسفہ تک کے کلام کے تمام مراتب پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا انداز بیان بڑا ہی شگفتہ اور ادیبانہ ہے مصنف نے فارسی اور اردو زبان کے بہترین اشعار کا برمحل اور

برجستہ استعمال کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتداء مصنف نے اس مشہور شعر ۷

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بمار سید

سے کی ہے اور آخر تک "چیزے فزوں کند" پر عمل کرتے ہوئے کتاب
اس شعر پر ختم کیا ہے ۷

تازیم در غم تو جامہ درم
و زپں مرگ، نوبت کفن ست

اس کتاب میں سید سلیمان اشرف نے نہ صرف جرجی زیدان کا جواب دیا ہے بلکہ
بہت ایسی مفید بحثیں بھی کتاب میں شامل کر دی ہیں، جن کا محققین نے صرف اجمالاً
اپنی کتابوں میں ذکر کیا تھا۔ مثلاً "فلسفہ اشتقاق" کے بارے میں اشکال ستہ کی ترتیب و
مثالیں، متقدمین نے اشتقاق صغیر و کبیر کے قواعد و ضوابط کا ذکر تو کیا ہے لیکن مثالیں
بہت کم پیش کی ہیں مگر انہوں نے پوری ۳۳ مثالیں کتاب میں درج کی ہیں جو دس
صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں یہ مثالیں عربی زبان کی جامعیت، مصنف کی وسعت
مطالعہ اور ذہن رسا کا بہین ثبوت ہیں۔

سید سلیمان اشرف کی یہ تصنیف در صل ایک یہودی مستشرق جرجی زیدان کے
مقالہ "فلسفہ الغة العربیة" کا رد ہے اس مقالہ میں تحقیق کے نام پر مغالطہ انگیزی
سے کام لے کر عربی زبان پر جرجی زیدان نے رکیک حملے کئے تو سید سلیمان اشرف
نے اس کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے "المبین" تصنیف فرمائی۔ اس میں
دیگر زبانوں کے مقابلے میں عربی زبان کی قدامت و برتری اور اس کے بے مثال محاسن
و کمالات نہایت تحقیق کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں زبان و بیان کی دلکشی قاری کو

متاثر کرتی ہے اور وہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔
 صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی و ڈاکٹر اقبال اور مشہور مستشرق
 پروفیسر براؤن جیسے ناموروں نے اس کتاب کو خراج تحسین پیش کیا ہے چنانچہ
 پروفیسر براؤن کے لفظوں میں:-

”مولانا نے اس عظیم موضوع پر اردو میں یہ کتاب لکھ کر ستم کیا، عربی یا انگریزی
 میں ہوتی تو کتاب کا وزن اور وقار بڑھ جاتا۔“ ۵۰
 مولانا سید سلیمان اشرف نے المبین کے ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھی بھیجا تھا اتفاقاً
 کچھ دن بعد اقبال علی گڑھ گئے تھے تو دوران ملاقات اس کتاب کی بڑے تعریف کی
 اور اس سے بہت متاثر ہوئے اس ملاقات کا ذکر پروفیسر رشید احمد صدیقی ان الفاظ
 میں کرتے ہیں:-

”المبین شائع ہوتی تو اس کی ایک نسخہ سر اقبال مرحوم کو بھی
 بھیجا تھا اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبال مرحوم اپنے لکچروں کے
 سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین
 کی ملاقات ہو گئی المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبال مرحوم نے
 بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض
 ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا
 ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا
 جب سر اقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولانا دوسرے ایڈیشن میں اگر
 اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہو گا۔“ ۵۱

مولانا سید محمد سلیمان اشرف قدس سرہ، اردو کی اہم خدمات انجام دینے کے بعد ۵
 ربیع الاول مطابق ۲۵ اپریل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے

اور علی گڑھ شروانیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ تذکرہ علمائے اہل سنت از محمود احمد قادری ص ۱۰۱ میں تحریر ہے کہ مولانا کا وصال رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں ہوا جو مولانا عبدالحکیم اشرف قادری (لاہور) کی تحقیق کے مطابق غلط ہے۔ عبدالحکیم اشرف قادری نے عبدالقدوس ہاشمی کی کتاب ”تقویم تاریخی“ (ص ۳۴۰) کا حوالہ دے کر تکملہ باغی ہندوستان ص ۴۰۲ میں ۵ ربیع الاول مطابق ۲۵ اپریل (۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) تاریخ وصال تحریر کیا ہے جو درست ہے۔

<http://t.me/Tehqiqat>

(۱۰)

مولانا مصطفیٰ رضا خاں نوری بریلوی

مولانا مصطفیٰ رضا خاں ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد رکھا گیا اور عرفی نام مصطفیٰ رضا تجویز کیا گیا۔ نوری تخلص تھا۔ وہ مولانا احمد رضا خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے ان کے بڑے بھائی کا نام مولانا حامد رضا خاں تھا ان کی پانچ بہنیں تھیں۔ انہوں نے ابتدا میں اپنے بڑے بھائی سے تعلیم حاصل کی اور والد بزرگوار سے علوم دینیہ سیکھا۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں بہت ہی ذہین اور سخت پابند شرع تھے۔ علوم شریعہ فقہ، تفسیر و حدیث، ادب و منطق و فلسفہ، علم توقیت اور فن تاریخ گوئی میں ان کو نہایت درجہ لیاقت تھی اسی لیے ان کو مفتی اعظم کے خطاب سے نوازا گیا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے اپنے مسلک کی خوب خوب نشر و اشاعت کی اور اس کے لیے متعدد تحریکات کا مقابلہ کیا اور نمایاں خدمات انجام دیں اس سلسلے کی چند

تحریرات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا ان تحریکوں میں کارکردگی سے ^{مصطفیٰ رضا} خان کی سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

تقریباً ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں مولانا احمد رضا نے ”انصار الاسلام“ قائم کی جن کا مقصد حمایت خلافت و حفاظت سلطنت اسلامی تھی، مظلومین ترک کی اعانت کے لیے عملاً اقدام کرنا اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت انصار الاسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا حسنین رضا (برادر عم زاد مولانا احمد رضا بریلوی) تھے۔ عالم شباب میں مولانا ^{مصطفیٰ رضا} خان اس کے رکن کین تھے۔ انصار الاسلام کے ایک جلسہ کی قرار داد کے چند نکات ملاحظہ ہوں، اس سے اندازہ ہو گا کہ عنفوان شباب ہی سے مولانا کس نوعیت کی سیاست کے قائل اور عامل تھے اور مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں کس قدر بہمدردی اور اصلاح کا جذبہ موجود تھا اس کے سبب انہوں نے حفاظت مقامات مقدسہ اور مظلومین ترک کی امداد و اعانت کی بھرپور کوشش کی۔

جماعت رضائے ^{مصطفیٰ بریلی} رجب الاول ۱۳۳۹ھ / ۱۷ دسمبر ۱۹۲۰ء کو قائم ہوئی اس کے مقاصد یہ تھے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت کا تحفظ۔

(ب) متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کرنے والے فرقہ گاندھویہ کا تحریری و تقریری رد کرنا۔

(ج) بد مذہبوں کی چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا۔

(د) آریہ اور عیسائیوں کے اعتراضات کے تحریری و تقریری جوابات دینا۔

(ه) مولانا احمد رضا اور دوسرے علمائے اہل سنت کی تصنیفوں کی اشاعت،

غیر اسلامی نظریہ متحدہ قومیت کے ہیجانی دور میں اسلامی تشخص کے

امتيازات کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنا اور شعائر اسلامی کا تحفظ۔

فتنہ ارتداد کے انسداد اور عوام میں راسخ الاعتقادی پیدا کرنے میں جماعت رضائے مصطفیٰ نے مثالی اور موثر کام کیا۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں اس کے رکن رکن تھے اس جماعت کے ساتھ منسلک رہ کر مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام اور تحریک آزادی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں شردھانند کے فتنہ ارتداد کا مقابلہ کیا اور تبلیغی مشن میں مصروف رہے۔ ۱۳۶۶ھ / اپریل ۱۹۴۶ء میں تحریک آزادی کی حمایت کے سلسلے میں آل انڈیا سنی کانفرنس (جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ) کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اسلامی حکومت کے لائحہ عمل کی تشکیل کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے اہم رکن تھے۔ مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے پانچ لاکھ ہندوؤں کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔

اپنے والد ماجد مولانا احمد رضا خان کی اہم تصنیف "دوام العیش فی الائمہ من قریش" جو خلافت شرعیہ سے متعلق تھی، انہوں نے اس پر ایک اہم دیباچہ کا اضافہ کر کے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ تحریک ترک موالات ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء کے دور میں گاندھی جی کے ساتھ بڑے بڑے مسلمان لیڈر اور علماء بھی پیش پیش رہے وہ ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ ترک موالات کے دور میں انگریزوں سے ہر قسم کا قطع تعلق روار کھا گیا جب کہ ہندو قوم سے اتحاد و داد کی باتیں ہونے لگیں حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے دونوں غیر مسلم ایک جیسے سلوک کے مستحق تھے مگر جذبات کی سیاست نے معاملہ الٹ دیا۔ اسی دور میں مولانا احمد رضا اور ان کے ہم نوا عالموں اور دانشوروں نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ مسلمان بحیثیت مسلمان قوم کے ہر دوسری قوم سے ممتاز ہے کسی دوسری قوم سے اس کا اتحاد و داد ممکن نہیں اور نہ شرعی طور پر جائز ہے۔ اسلامی تشخص کا تحفظ اور اس کو نکھارنے میں مولانا مصطفیٰ رضا خان نے مثالی کردار ادا کیا۔

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے انگریز حکام کی پشت پناہی میں لاہور کی

مسجد شہید گنج کو مسمار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ جگہ اور عمارت گور دوارا کی ہے۔ مسلمانوں نے اسے قبضہ کر رکھا ہے۔ مسجد کے انہدام پر مسلمانوں نے تحریک کا آغاز کر دیا جلسے اور جلوسوں کا بازار گرم ہوا۔ مجلس احرار ہند نے مسلمانوں کی اجتماعی مساعی میں نہ صرف عدم شرکت کی بلکہ اس خالص اسلامی تحریک کی مخالفت کی اور اس تحریک میں حصہ لینا ناجائز قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو مسلمان اس تحریک میں جان دے گا ان کی موت حرام ہوگی وہ شہید نہیں۔ ۲۷ ربيع الثانی ۱۳۵۴ھ / ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء۔ کو مسجد شہید گنج کی بازیابی کے ضمن میں ہلاک ہونے اور تحریک میں حصہ لینے والوں کی شرعی حیثیت سے متعلق ایک استفتاء۔ مولانا مصطفیٰ رضا خان کے پاس لایا گیا انہوں نے نہایت تفصیل سے شرعی دلیلوں سے ثابت کیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس تحریک میں حصہ لے کر مسجد کو سکھوں سے آزاد کروائیں اور جو لوگ اس تحریک میں جان کی قربانی دیں گے وہ شہید ہیں۔

۲۰ ویں صدی کے اوائل میں اشتراکیت کا فتنہ روس سے پیدا ہوا ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں کانگریسی لیڈروں نے اشتراکیت کی اشاعت کی اور اسے ہندوستانیوں کی مشکلات کا حل بتایا۔ یو۔ پی وغیرہ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے اشتراکیت کے بہروپ میں ناقابل برداشت مظالم ڈھاتے ان مظالم کا نشانہ مسلمان تھے۔ ۲ محرم ۱۳۵۷ھ / ۵ مارچ ۱۹۳۸ء۔ کو ایک مدلل و مبسوط فتویٰ کی صورت میں مولانا مصطفیٰ رضا خان نے اشتراکیت کے بے خدا نظام کی خامیوں کو اجاگر کیا اور اس دہریانہ نظام کے مخترعین کی بے عقلیوں اور کوباطنی کو دلائل سے واضح کیا۔

برصغیر میں ۲۰ ویں صدی کے رجب اول ہی میں استخلاص وطن کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ رجب ثانی میں یہ تحریکیں اپنے عروج پر تھیں مگر ان تحریکوں میں بعض اس قسم کے طریقے وضع ہوئے اور ان پر عمل بھی ہونے لگا جس کا نتیجہ مسلمانوں کی ہمیشہ کی

ہندوؤں کی غلامی مقدر ہو جاتی۔ علمائے اہل سنت کا موقف یہ تھا کہ وطن کی آزادی کے بعد مسلمان بھی آزاد ہوں۔ انہیں ہندوؤں کی سرپرستی اور غلامی سے بھی چھٹکارا ملنا چاہیے۔ اس کے لیے کانگریس اور کانگریسی مسلمان لیڈر تیار نہ تھے بلکہ ان کی مخالفت کافی بڑھ گئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے معاشرتی، تجارتی، معاشی، تمدنی، تعلیمی اور سیاسی حقوق کو ہندوؤں پر قربان کیا جانے لگا اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر علمائے اہل سنت نے کل ہند سنی کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء میں مراد آباد میں اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کر کانفرنس کی شاخیں پورے ہندوستان میں قائم ہو گئیں۔ مولانا ^{مصطفیٰ} رضا خاں اس کانفرنس کے مرکزی سرپرست تھے۔ ان کی سربراہی اور رہنمائی میں آل انڈیا سنی کانفرنس نے برصغیر کی سیاست میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

وائسرائے ہند لارڈ ویول نے شملہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کرانے کے لیے ایک کانفرنس کی۔ مسلم لیگ کا موقف تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم ہے جب کہ کانگریس متحدہ ہندوستان کے پورے باشندوں کی نمائندگی کی دعوے دار تھی۔ مولانا ^{مصطفیٰ} رضا خاں نے قائد اعظم پاکستان (محمد علی جناح) کے نام ایک تار میں مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی حمایت کی مولانا کا یہ تار روز نامہ انجام دہلی مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ء میں بھی شائع ہوا۔

۴۶ / ۱۹۴۵ء کے برصغیر کے مرکزی اور صوبائی انتخابات تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں انتخابات کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ استخلاص وطن کے ساتھ اسلامی ریاست کا قیام انہیں انتخابات کا مرہون منت تھا اس صورت حال میں علماء و مشائخ اہل سنت نے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم مسلم لیگ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اس کے لیے علماء نے باقاعدہ فتویٰ جاری کئے ان

فتاویٰ پر مولانا مصطفیٰ رضا خاں اور ان کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث علامہ سردار احمد خاں صاحب کے دستخط سرفہرست ہوتے۔

آل انڈیا سنی کانفرنس کا ایک عظیم اجلاس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ / ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پانچ سو اہل سنت کے مشائخ، سات ہزار علماء اور دو لاکھ سے زیادہ اہل سنت کے عوام شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے مرکزی کردار ادا کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کانفرنس کی طرف سے جو مختلف کمیٹیاں بنائیں ان میں سے بعض کی سربراہی مولانا نے قبول کی۔ جن مجالس میں ان کا انتخاب ہوا وہ یہ ہیں:-

تعلیم پاکستان، دارالقضاة، عائلی قوانین، جمعیت آئین ساز وغیرہ۔

کانگریسی حکومت ہند نے غیر منصفانہ طور پر اہل سنت کے اداروں اور اوقاف پر غیر سنیوں کو بالادستی کا حق دے دیا۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت ہند نے ایک وقف ایکٹ کے ذریعہ اہل سنت کے حقوق پامال کرنے کی کوشش کی، نیز مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کا اسلامی تشخص اور امتیاز ختم کرنے کی سازش کی اور مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے مذہبی مقامات مساجد و مزارات کو چھیننے کی کوشش کی کے سدباب کے اس لیے مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی نے تمام علماء و مشائخ کو اکٹھا کیا اور دسمبر ۱۹۶۱ء آل انڈیا سنی اوقاف کانفرنس دہلی میں منعقد کی اس میں ڈیڑھ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ وزیر اعظم ہند اور دیگر صاحبان اقتدار نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور مسلمانوں کے مطالبات کو غور سے سنا اور اس پر عمل کیا اس طرح اہل سنت کے مذہبی ادارے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھ سکے اور مسلمانوں کی مشہور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ غیر مسلم حکومت سے محفوظ رہی۔

اس کانفرنس کی کامیابی کے بعد مولانا مصطفیٰ رضا خاں صاحب کی سرپرستی میں

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی نے کل ہند تعلیمی تنظیمی کانفرنس، دہلی کے ذریعہ ہندوستان کے تمام سنی اداروں اور مدرسوں کو مربوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ ملک کے گوشے گوشے کا دورہ کرنے اور ان اداروں کے تفصیلی کوائف مرتب کرنے کے لیے ایک وفد ترتیب دیا گیا۔

۱۳۵۷ھ میں مسجد بی بی مرحومہ، بریلی میں دارالعلوم مظہر اسلام مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی کی سرپرستی میں قائم ہوا ان کے تلمیذ رشید شیخ الحدیث علامہ سردار احمد صاحب اس دارالعلوم کے منظم اور شیخ الحدیث تھے۔ تقسیم ہند کے بعد شیخ الحدیث صاحب پاکستان چلے گئے اس وقت دارالعلوم کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ مسجد کے صحن اور حجرے طلباء اور اساتذہ کی رہائش گاہ تھی اور مسجد کا صحن درس گاہ تھا۔ اس ارارہ نے تعلیمی اور روحانی خدمات سرانجام دیں اس کے بعد ایک رضالا تبریری اور باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے ایک رضا گیسٹ ہاؤس کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اس کے لیے تحریک شروع کر دی۔ جگہ کے تعین کا کام سب سے مشکل تھا لیکن ۱۹۶۲ء سے اس کے لئے کوشش شروع کر دی گئی۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی ریلیف کمیٹی کو اس عظیم منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام سونپا گیا۔

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی اس وقت اس کی حیثیت ایک مقامی جمعیت کی تھی اس جمعیت کے دو بڑے شعبے تھے۔ علمی و عملی۔ اس جمعیت نے دونوں پہلوؤں پر تاریخ ساز کردار سرانجام دیا لوگوں میں مقبول ہو کر اس کی ایک مرکزی حیثیت ہو گئی اور پورے برصغیر میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اس بنیاد پر وقتاً و وقتاً اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۴ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ / ۱۳ اکتوبر

۱۹۶۳ء کو مولانا مصطفیٰ رضا خاں کی سرپرستی میں مولانا برہان الحق جبل پوری (خلیفہ مولانا احمد رضا) کے یہاں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا ایک اجلاس منعقد ہو جس میں حسب ذیل دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۱) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی دائمی سرپرستی مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی فرمائیں گے۔ (۲) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ سارے ہندوستان کی کل مقامی ضلعی، صوبائی اور کل ہند جملہ سنی تنظیموں کی نگران اور جماعت ہوگی۔ ہندوستان کی ساری سنی تنظیمیں اور جماعتیں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کے تحت رہیں گی۔ (۳) مختلف سنی تنظیموں کے باہمی اختلاف کی شکل میں کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی حیثیت ثالث اور حکم کی ہوگی۔ (۴) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی جماعت کی تنظیم حسب ذیل ہوگی۔

(۱) ہر شہر میں دارالافتاء قائم کرنا

(ب) ہر شہر میں دارالافتاء قائم کرنا

(ج) ہر جگہ مکاتب و مدارس اسلامیہ قائم کرنا

(د) ہندوستان کے ہر شہر کے مفتی اور قاضی کا براہ راست تعلق کل ہند رضائے مصطفیٰ سے ہوگا۔

مسلمانوں کی قومی و مذہبی نزاعات کے فیصلے کے لیے قاضی کی شرعی ضرورت چونکہ ہندوستان کی موجودہ سیکولر نظام حکومت میں ممکن نہ تھی لہذا اس اہم ضرورت کو جماعت رضائے مصطفیٰ کی مرکزی حیثیت پورا کرے گی۔ (۵) کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا مرکزی دفتر بریلی ہی میں زیر نگرانی مولانا مصطفیٰ رضا خاں رہے گا۔ (۶) ریلیف کمیٹی، مرکزی جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی نگرانی، ترمیمی اور تبدیلی کے

کل اختیارات سرپرست و صدر کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کو حاصل رہیں گے۔
 جبل پور کے اس کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کے خصوصی اجلاس سے قبل
 مولانا احمد رضا کے عرس کے موقع پر ۲۶ صفر ۱۳۸۳ھ / ۱۸ جولائی ۱۹۶۳ء کو کل
 ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا مرکزی انتخاب عمل میں لایا گیا جس میں مولانا برہان الحق
 جبل پوری کو کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کا صدر اور جناب مولانا ابو الوفا قصیحی
 غازی پوری کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا جا چکا تھا اب اس جبل پور کے اجلاس میں بقیہ
 عہدیداران کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا:- نائب صدر اول جناب مولانا سید محمد
 مدنی کچھوچھوی، نائب صدر دوم جناب مولانا رفاقت حسین احسن المدارس کان پور،
 ناظم مولانا محمد دھوراجی (راج پیلا بھڑوچ، گجرات)، نائب ناظم جناب عبدالصمد
 مجنوں، جبل پور، نائب ناظم و خازن سید حمایت رسول (نزد جامع مسجد بریلی) اس کے
 علاوہ متعدد علمائے کرام کو کل ہند جماعت رضائے مصطفیٰ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر
 نامزد کیا گیا۔

اس طرح مولانا مصطفیٰ رضا خان کی سرپرستی میں جماعت رضائے مصطفیٰ کی نشاۃ
 ثانیہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی و قومی اسلامی ضرورت کو پورا کرنے کی بھرپور
 کوشش کی۔

ہندوستان کی سیکولر حکومت اپنے دعویٰ لادینیت پر قائم نہ رہی۔ کانگریس کے
 نمائندگان کی حکومت نے غیر جانبداری کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ہندوستان کے
 مسلمانوں کی دینی، اقتصادی، لسانی اور سیاسی حقوق کی پامالی کے واقعات اس قدر عام
 ہو گئے کہ ایثار کا جذبہ رکھنے والے علماء نے محسوس کیا کہ ان کی ایک کل ہند
 مرکزی و سیاسی تنظیم ہو جو مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کا فریضہ سر
 انجام دے چنانچہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۳ھ / نومبر ۱۹۶۳ء کو آل انڈیا سنی جمعیت

العلماء کانفرنس کا عظیم اجتماع کان پور میں ہونا متعین پایا۔ اس کانفرنس کی سرپرستی مولانا مصطفیٰ رضا خان نے فرمائی۔

حکومت کے چند دوسرے ایسے اقدامات کی بھی کھل کر مخالفت کی گئی جو مذہب اسلام کے منافی تھے۔ حکومت کی طرف سے نافذ نسبندی کے خلاف مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی نے قلم اٹھایا اور بے باکی اور حق گوئی سے کام لیتے ہوئے فتویٰ جاری کیا کہ نسبندی حرام ہے، حرام ہے، حرام ہے۔ اس فتویٰ کے خلاف ان کی گرفتاری کی صورت حال پیدا ہو گئی مگر ملک میں ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مرکزی حکومت (اس وقت اندرا گاندھی کی حکومت تھی) نے مداخلت کر کے ضلع کلکٹر کو اس فعل سے باز رہنے کی تلقین کی چونکہ ان کی گرفتاری سے پورے ملک میں تشدد کا اندیشہ تھا پھر منشی مصطفیٰ رضا صاحب خود اپنا فتویٰ واپس نہیں لیں گے لہذا صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد نرمی برتی گئی اور جبری نسبندی کا نفاذ مسلمانوں کے لیے روک دیا گیا یہ مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی کی بڑی کامیابی تھی جس کا سہرا ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے سر ہے غیرت دینی کا یہ عالم تھا کہ بانوسے برس کی طویل عمر میں کبھی کسی سربراہ مملکت کے ہاں ان کو نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ بڑے بڑے فرمانرواؤں کے بنگلوں میں نظر آتے۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان کی فتویٰ نویسی اور فقہی بصیرت

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء میں جب مولانا مصطفیٰ رضا خان کی عمر ۱۸ سال تھی وہ کسی

کام سے رضوی دارالافتاء میں پہنچے تو وہاں مولانا ظفر الدین بہاری اور مولانا سید عبد الرشید عظیم آبادی فتویٰ لکھنے کے لیے رضاعت کے کسی مسئلہ پر تبادلہ خیال کر

رہے تھے مسئلہ کے سلسلہ میں بات کچھ الجھی تو مولانا ظفر الدین صاحب "فتاویٰ رضویہ" الماری سے نکالنے کے لیے اٹھے تاکہ اس سے فائدہ حاصل کریں اتنے میں مولانا مصطفیٰ رضا خان نے کہا کہ فتاویٰ رضویہ دیکھ کر جواب لکھتے ہو؟ تو مولانا ظفر الدین صاحب نے فرمایا اچھا تم بغیر دیکھے لکھ دو تو جانوں اتنا کہتا تھا کہ مولانا مصطفیٰ رضا خان نے فوراً یہ فتویٰ لکھ دیا مولانا خود فرماتے ہیں:-

"نو عمری کا زمانہ تھا۔ میں نے کہا فتاویٰ رضویہ دیکھ کر جواب لکھتے ہو؟ مولانا نے فرمایا! اچھا تم بغیر دیکھے لکھ دو تو جانوں میں نے فوراً لکھ دیا وہ رضاعت کا مسئلہ تھا" ۵۲

جب مسئلہ رضاعت کا فتویٰ اصلاح کے لیے مولانا احمد رضا خان قدس سرہ کو پیش کیا گیا تو مولانا فاضل بریلوی نے فتویٰ کا خط پہچان لیا انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس نے دیا ہے؟ حال فتویٰ نے بتایا کہ "چھوٹے میاں" نے (گھر میں لوگ پیار میں مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کو چھوٹے میاں کہتے تھے) ان کو مولانا احمد رضا خان نے بلایا وہ حاضر ہوئے تو انہوں نے فاضل بریلوی کو خوش دیکھا اور فرمایا کہ اس پر دستخط کرو۔ دستخط کروانے کے بعد مولانا احمد رضا خان نے "صحیح الجواب بعون اللہ العزیز الوہاب" لکھ کر اپنے دستخط کئے۔ اس طرح اگر ایک طرف مولانا مصطفیٰ رضا کو رضوی دارالافتاء کے مفتیوں پر سبقت حاصل ہو گئی تو دوسری طرف مولانا احمد رضا بریلوی کی طرف سے فتویٰ نویسی کی باقاعدہ اجازت مل گئی چھوٹی عمر میں انہیں یہ بڑا اعزاز حاصل ہوا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان کے اس طرح فتویٰ نویسی کے آغاز پر مولانا احمد رضا خان نے اپنے صاحب زادے کو پانچ روپے بطور انعام دے کر کہا۔

"تمہاری مہر بنو ادیتا ہوں۔ اب فتویٰ لکھا کرو۔ اپنا ایک رجسٹر

بنالو۔ اس میں نقل بھی کیا کرو۔ " ۵۲

مولانا احمد رضا نے اپنے ہاتھ سے مہر کا خاکہ تیار کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔ " ابو البرکات محی الدین جیلانی، آل رحمن، عرف مصطفیٰ رضا " ۵۲ پھر اسے مولانا حافظ یقین الدین بریلوی کے بھائی کے حوالہ کیا۔ جب مہربن کر آگئی تو اسے اپنے صاحبزادے مصطفیٰ رضا کو بلا کر دے دیا، یہ مہر دینی شعور کی سند تھی۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب دارالافتاء میں مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا امجد علی اعظمی اور مولانا برہان الحق جبل پوری کے رفیق رہے اور فتویٰ نویسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ پھر آپ کی نگرانی میں بیسیوں عالموں نے فتویٰ نویسی کی مشق کی اور مفتی بنے۔ ان کے فتاویٰ کی دو جلدیں مسمیٰ بہ "فتاویٰ مصطفویہ" شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا رضا بریلوی کو اپنے لائق صاحبزادے کے فقہت اور ثقاہت پر بڑا ناز تھا۔ اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض فتوؤں پر ان کے تائیدی دستخط تک کرا لیتے تھے۔ مولانا احمد رضا قدس سرہ نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مسائل مولانا مصطفیٰ رضا سے لکھوائے اور ان کی تصدیق و تصویب فرما کر اپنے دستخط کرتے تھے۔

رجب ۱۳۳۹ھ میں مولانا احمد رضا نے متحدہ ہندوستان کے لیے "دارالقضا۔ شرعی" قائم کیا۔ اور بعض علماء کی موجودگی میں مولانا امجد علی اعظمی اور مولانا مصطفیٰ رضا کو افتاء اور قضا کے منصب پر مامور کیا۔ آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس کے اجلاس کی مجلس سوم میں ۱۲۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو بوقت ۹ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر اندرون باغ فاطمان میں جو ۲۱ تجاویز باتفاق رائے منظور ہوئیں ان میں تجاویز نمبر ۹-۱۰-۱۱-۱۲ اور ۱۳ ملاحظہ ہوں۔

(۹) آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ بریلی میں مولانا مصطفیٰ رضا خان کے زیر قیادت ایک مرکزی دارالافتاء کا انتظام کیا جائے جس میں کم سے کم

چار جید عالموں کی خدمات حاصل کی جاتیں اور مولانا امجد علی اعظمی اس کی سرپرستی و نگرانی فرمائیں۔ (۱۰) ملک کے کسی مقام پر جس کسی فتوے میں تردد یا اختلاف ہو آخری حکم معلوم کرنے کے لیے اس دارالافتاء میں بھیجا جائے دینی و مذہبی رسائل چھپنے سے پہلے یہاں بھیج کر تصدیق و تصحیح بھی کرائی جاسکتی ہے اس طرح مذہبی نظام انتشار و اختلاف سے محفوظ رہے گا۔ (۱۱) اس دارالافتاء کے مصارف کے لیے اسلامی ریاستوں سے اور اہل ثروت مسلمانوں سے امدادیں طلب کی جائیں۔ (۱۲) اسلامی مدارس اس دارالافتاء کے لیے حسب حیثیت ماہانہ مقرر کریں (۱۳) خانقاہوں کے اوقاف سے اعانتیں مقرر کرائی جائیں۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں جب حج بیت اللہ کے لیے گئے تو حجاز، مصر، شام، عراق، اور ترکی وغیرہ کے عالموں نے ان سے مسائل دریافت کئے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس عرب، افریقہ، ماریش، انگلینڈ، امریکہ، سری لنکا، ملیشیا، بنگلہ دیش، اور پاکستان سے استفتاء آتے اور انہوں نے ان کے جوابات لکھے۔

روایت ہلال سے متعلق استفتاء کا جواب

جنرل محمد ایوب خاں سابق صدر پاکستان کے دور میں پاکستانی حکومت کی طرف سے ایک روایت ہلال کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے ذمہ عیدین کے موقعوں پر ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنا تھا اور پھر روایت ہلال کمیٹی کی تصدیق پر حکومت کی جانب سے چاند کی روایت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر ۲۹ رمضان کو اس کمیٹی کے کچھ افراد ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنے گئے، مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) سے مغربی پاکستان جاتے ہوئے ان افراد کو چاند نظر آگیا اور انہوں نے

اس کی اطلاع حکومت وقت کو دے دی۔ جس کے نتیجہ میں حکومت پاکستان نے رویت ہلال کا اعلان کر دیا مگر پاکستان کے سنی علماء نے اس پر اعتماد نہ کیا۔ دنیا سے اسلام کے بیشتر ملکوں میں مفتیان کرام سے اس مسئلہ میں فتویٰ مانگا گیا اور ایک استفتاء۔ مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کے پاس بھیجا گیا دنیا کے تقریباً تمام مفتیوں نے رویت ہلال کمیٹی کی تائید کی مگر مولانا نے اسے نہیں مانا اور علاحدہ سے یہ فتویٰ صادر کیا کہ:-

”چاند کو زمین سے دیکھ کر روزہ رکھنے اور عید کرنے کا شرعی حکم ہے اور جہاں چاند نظر نہ آئے وہاں شرعی شہادت پر قاضی شرع حکم دے گا۔ چاند کو سطح زمین سے یا ایسی جگہ سے جو زمین سے ملی ہو وہاں سے دیکھنا چاہیے۔ رہا جہاز سے چاند دیکھنا تو یہ غلط ہے، کیوں کہ چاند غروب ہوتا ہے فنا نہیں ہوتا اس لیے کہیں چاند ۲۹ اکتوبر کو اور کہیں ۳۰ کو نظر آتا ہے۔ اور اگر جہاز میں چاند دیکھ کر رویت کا اعلان درست ہوتا تو مزید بلندی پر جا کر چاند ۲۸، ۲۷ تاریخ کو بھی نظر آسکتا ہے تو کیا ۲۸، ۲۷ تاریخ کو چاند دیکھ کر یہ حکم صادر کیا جاسکتا ہے کہ اگلے روز عید یا بقر عید جاتز ہے اسی طرح جہاز سے چاند دیکھ کر یہ فتویٰ صادر کرنا کہ ۲۹ کا چاند دیکھنا معتبر ہے بھلا کس طرح صحیح ہو گا۔“

فقیر مصطفیٰ رضا قادری غفرلہ " ۵۵

ان کے اس فتوے کو پاکستان کے ہر اخبار میں جلی سرخیوں سے شائع کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے ہلال کمیٹی کو توڑ دیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھنے کا سلسلہ منوخ کر دیا گیا۔

مولانا مصطفیٰ رضا خان نے اپنے والد ماجد کی زندگی میں ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء سے

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء۔ ایک فتاویٰ لکھے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد ۱۳۹۵ھ تک مسلسل فتویٰ نویسی کی۔ اس کے بعد ضعف و علالت کی وجہ سے فتویٰ نویسی کا کام نہ ہو سکا تاہم آخری لمحات تک مفتیان دین کی علمی مشکلات کو زبانی حل کرتے رہے اس طرح ۷۰ سال کے طویل عرصہ تک بلا معاوضہ فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اردو کے علاوہ عربی و فارسی زبان میں بھی فتویٰ صادر فرماتے تھے۔ مولانا مصطفیٰ رضا کے فتاویٰ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر فیضان علی رضوی نے صرف ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۵۹ھ تک دس گیارہ سال کے فتاویٰ کی نقل اصل رجسٹر سے دو جلدوں میں "فتاویٰ مصطفویہ" کے نام سے شائع کرایا۔ پہلی جلد میں کتاب الایمان اور دوسری جلد میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ اور احکام مسجد درج ہیں۔ باقی ان کے تمام فتاویٰ غیر مطبوعہ ہیں۔

تصنیف و تالیف:-

درس و تدریس کے علاوہ مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ کی اور مذہبیات و سیاسیات دونوں پر قلم اٹھایا۔ سیاسیات سے متعلق مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا احمد رضا بریلوی کے درمیان مراسلات کو الطاری الداری کے نام سے تین حصوں میں مرتب کر کے مؤرخین کے لیے ایک تاریخی دستاویز مہیا کر دی۔ مولانا مصطفیٰ رضا نے تقریباً پچاس سے زائد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جس میں کچھ قلمی ہیں اور زیادہ تر چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا صاحب کو تمام علوم اسلامیہ، معقول و منقول وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل تھی تاہم تذکرہ نویوں نے ۳۰ علوم کی فہرست پیش کی ہے۔ جن کی جملک ان

کی تصنیفات میں نظر آتی ہے۔ ان کی جن تصانیف کا پتہ مجھے چل سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

- ۱ --- اشدالباس علی عابد الخناس ۱۳۲۸ھ (اردو)
- ۲ --- الکاوی فی العاوی والغاوی ۱۳۳۰ھ (اردو)
- ۳ --- القثم القاصم للداسم القاسم ۱۳۳۰ھ (اردو)
- ۴ --- نور الفرقان بین جند الالہ واحزاب الشیطان ۱۳۳۰ھ (اردو)
- ۵ --- وقعات السنان فی حلقة مسماة بسط البنان ۱۳۳۰ھ (اردو)
- ۶ --- الریح الدیانی علی راس الوسواس الشیطانی ۱۳۳۱ھ (اردو)
- ۷ --- وقایہ اہل سنتہ عن مکر دیوبند وافتنہ ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۸ --- الہی ضرب بہ اہل الحرب ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۹ --- ادخال السنان الی الحنک الحلقی بسط البنان ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۰ --- نہایت السنان ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۱ --- صلیم الیدان لتقطیع حبالۃ الشیطان ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۲ --- سیف القہار علی العبد الکفار ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۳ --- نفی العار من معائب المولوی عبد الغفار ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۴ --- النکتہ علی مرآة کلکتہ ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۵ --- مقتل کذب وکید ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۶ --- مقتل الکذب واجہل ۱۳۳۲ھ (اردو)
- ۱۷ --- الموت الاحمر علی کل الجنس الکفر ۱۳۳۷ھ (اردو)
- ۱۸ --- ملفوظات اعلیٰ حضرت (چار حصص) ۱۳۳۸ھ (اردو)
- ۱۹ --- الطاری الداری لمہفوات عبد الباری (تین حصص) ۱۳۳۹ھ (اردو)

- ۲۰ -- القول العجیب فی جوار التثویب ۱۳۳۹ھ (اردو)
- ۲۱ -- طرق الہدی والارشاد فی احکام الامارۃ والجمہاد ۱۳۴۱ھ (اردو)
- ۲۲ -- حجة واپرہ بوجوب الحجۃ الحاضرہ ۱۳۴۲ھ (اردو)
- ۲۳ -- القسورہ علی ادوار الحمر الکفرہ ۱۳۴۳ھ (اردو)
- ۲۴ -- سامان بخش عرف گلستان نعت نوری مطبوعہ دلی ۱۳۵۴ھ (اردو، مجموعہ کلام)
- ۲۵ -- فتاویٰ مصطفویہ (دو حصص) از ۱۳۴۹ھ تا ۱۳۵۹ھ (اردو)
- ۲۶ -- شفاء العی فی جواب سوال بمبئی (اردو)
- ۲۷ -- تنویر الحجۃ بالتواء الحجۃ (اردو)
- ۲۸ -- وہابیہ کی تقیہ بازی (اردو)
- ۲۹ -- مسائل سماع (اردو)
- ۳۰ -- الحجۃ الباہرہ (اردو)
- ۳۱ -- نور العرفان (اردو)
- ۳۲ -- دارِ رحمی کاسندہ (اردو)
- ۳۳ -- ہشتاد بیڈ و بند بر مکال دیوبند (اردو)
- ۳۴ -- طرد الشیطان (اردو)
- ۳۵ -- سلک مراد آباد پر معترضانہ ریمارک (اردو)
- ۳۶ -- سل الحسام الہندی لنصرۃ سیدنا خالد النقشبندی (اردو)
- ۳۷ -- کانگریسیوں کا رد (اردو)
- ۳۸ -- کشف ضلال دیوبند (اردو)
- ۳۹ -- حاشیہ فتاویٰ رضویہ جلد اول (اردو)
- ۴۰ -- ترتیب فتاویٰ رضویہ جلد دوم

- ۴۱ -- حاشیہ فتاویٰ رضویہ جلد سوم (اردو)
- ۴۲ -- حاشیہ فتاویٰ رضویہ جلد چہارم (اردو)
- ۴۳ -- حاشیہ تفسیر احمدی (قلمی)
- ۴۴ -- حاشیہ فتاویٰ عزیزیہ (قلمی)

۴۵ -- حاشیہ و شرح الاستمداد علی ارجیال الارتداد مطبوعہ گلزار عالم پریس، لاہور (اردو)

نوٹ:- بعض محققین کے مطابق ترتیب نمبر ۳۸ پر رقم شدہ کتاب کشف ضلال دیوبند علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ اس حاشیہ کا عنوان ہے تحریر پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی بحوالہ "مفتی اعظم اور ان کے خلفاء" حاشیہ ۳ صفحہ ۱۰۰۔

مولانا مصطفیٰ رضا صاحب کی تمام تصنیفات و تالیفات ان کی علمیت و صلاحیت اور فقہی بصیرت و ژرف نگاہی کے منہ بولتے شاہکار ہیں۔ انہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات و مشاغل کے باوجود مختلف موضوعات پر تصنیفات و تالیفات کا ایک گرانقدر ذخیرہ چھوڑا ہے زبان پر اثر استعمال کرتے ہیں، الفاظ بر محل لاتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔ ان کی بعض اہم کتابوں کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے جنہیں دوسری کتابوں کو رد کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

وقعات السنان :-

یہ کتاب ۱۳۳۰ھ میں مکمل کی گئی یہ مطبع اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپی تھی۔ اس میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب "بسط البنان" پر اور مولوی قاسم نانوتوی کی "تحذیر الناس" پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔ اس کے اندر تھانوی صاحب اور ان کے ہم خیالوں سے ایک سو بیس سوالات کئے گئے ہیں یہ سوالات کتاب الکاوی فی العاوی والغاوی اور القاسم القاسم للذاسم القاسم اور اشد الباس علی عابد الخناس

(جو تحذیر الناس کا رد ہے) اور نور الفرقان بین جند الالہ و احزاب الشیطان وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ سوالات مسلک دیوبند پر کتے گئے ہیں۔ اس کا انداز سوال ملاحظہ ہو:-

سوال نمبر ۱۔ ”محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا جو قرآن عظیم میں منصوص اور مسلمانوں کے ضروریات دین سے ہے صرف یہ لفظ ضروریات سے ہے معنی کچھ گڑب نیجتے یا ان کے کوئی معنی ضروریات سے ہیں بر تقدیر ثانی وہ معنی کیا ہیں۔“

یہ مجموعہ سوالات رجسٹری کے ذریعہ تقانوی صاحب کے پاس بھیجا گیا جس کا جواب نہ آسکا۔

الموت الاحمرہ:-

یہ کتاب ۸ صفر المظفر ۱۳۳۷ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچی اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۹۴ھ میں مکتبۃ الحبیب سے طبع ہوا۔ اس میں مسلک دیوبند پر بھرپور نقد و تبصرہ کیا گیا ہے اور حق کی حقانیت کو واشگاف کیا گیا ہے اور مسلک دیوبند پر بڑے ٹھوس اعتراضات اور مضبوط مواخذے کتے گئے ہیں اس کے اندر کل ۸۰ سوالات و مواخذات ہیں۔ ۳۰ بحث اول ہیں، ۱۰ بحث دوم ہیں، ۲۰ بحث سوم ہیں اور ۲۰ تزییل ہیں۔ مسدہ خاتمیت محمدی اور مولوی اسماعیل دہلوی صاحب کی تکفیر فقہی کی بحثیں بھی نہایت تحقیق کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

ادخال السنان:-

یہ بسط البان کا دوسرا رد و جواب ہے اس کے بارے میں خود مصنف الموت الاحمر

میں رقمطراز ہیں:-

”اس میں آپ (تخانوی صاحب) سے ایک سو ساٹھ قاہر سوال نہیں، سروہا پیہ پر ایک سو ساٹھ جبال ہیں، چھ سال ہوئے کہ آپ تخانوی صاحب ظاہری (براہ راست خطاب میں تخانوی صاحب باطنی لکھا گیا ہے) کے یہاں رجسٹری شدہ گیا ہے اور آج تک بحمد اللہ تعالیٰ لا جواب ہے۔“ ۵۶

طرق الہدی والارشاد الی احکام الامارۃ والجمہاد۔

یہ رسالہ ۱۳۴۱ھ میں مصنف نے تحریر کیا اس کا خطبہ عربی زبان میں ہے اور طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی فصیح و بلیغ ہے عربی ادب کا ذوق رکھنے والا محظوظ ہوتے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ خطبہ کا ایک جملہ یہ ہے ”وحریم علی عبادہ و موالاتہ سائر الکفرۃ والمشرکین“ ○ اسی رسالہ میں اہل کفر و شرک سے محبت و مودت اور اتحاد کی حرمت بتائی گئی ہے اور اہل ایمان کو بڑے جوش و محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور احساس کمتری کے شکار مسلمانوں کو ان کا صحیح مقام و منصب بتایا گیا ہے۔

حاشیہ و شرح الاستمداد علی اجیال الارتداد۔

الاستمداد تین سو ساٹھ اشعار پر مشتمل اردو زبان میں ایک قصیدہ ہے جسے مولانا احمد رضا خاں نے نظم کیا ہے ان اشعار پر حواشی اور ان کی شرح مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے لکھی ہے اس مجموعہ کا تعارف اور شرح کے بارے میں خود شارح الاستمداد تحریر

فرماتے ہیں:-

”یہ سلسلے اردو زبان ہلکی بحر روشن بیان میں تین سو ساٹھ شعر کا ایک مبارک قصیدہ ہے ۳۵ میں نعت والا ہے۔ باقی میں عموماً وہابیہ اور خصوصاً دیوبندیہ کے دو سو تیس اقوال کفر و ضلال کا نمونہ ہے۔“

طرذ الشیطان:-

دوسرے حج کے موقع پر مصنف مولانا مصطفیٰ رضا خاں نے اس کتاب کی تصنیف کی جس کا دوسرا نام عمدۃ البیان بھی ہے یہ کتاب سعودی حکومت نے حج کے سلسلے میں جو ٹیکس لگاتے تھے اس کے رد میں لکھی اور مکہ ہی میں لکھی اس موقع پر بھی مصنف کی بے خوفی کا مظاہرہ دیکھتے سعودی حکومت نے اس سلسلہ میں بہت سختی کر رکھی تھی کہ اس ٹیکس کی جو مخالفت کرے اسے سخت ترین سزا دی جائے مگر انہوں نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور بے خوف ہو کر کتاب لکھ دی اور سعودی حکومت خاموش رہ گئی۔

شعروادب:-

مفتی مصطفیٰ رضا خاں اپنے دور کے باکمال شاعر تھے اور اپنے پیر و مرشد حضرت سید حسین احمد نوری مار بروی کی نسبت سے نوری تخلص کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ”سامان بخشش“ کے نام سے طبع ہوا جناب نوری نے جس صنف سخن میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ صنف نعت ہے انہوں نے اس خازن وادی میں خوب طبع

آزمائی کی ہے وہ ایک فطری شاعر تھے ان کا کوئی استاد نہ تھا۔ وہ ایسے ماحول کے تربیت یافتہ تھے جو علم و ادب کا گہوارہ تھا ان کے وطن بریلی کو دیکھتے جہاں بڑے بڑے شاعر و ادیب پیدا ہوئے اور بعض نے دوسری جگہوں سے یہاں آکر بود و باش اختیار کر لی۔ وہ بھی اس شہر (بریلی) کے ادبی ماحول میں ڈھل گئے۔

ان کا مجموعہ کلام ”سامان بخشش“ ہے جو حمد باری تعالیٰ نعتوں اور درود و سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ جسے مکتبہ شرق ۱۱۶ محلہ کانکر ٹولہ، بریلی نے شائع کیا ہے یہ گیارہ انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا اور ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سامان بخشش کی نعت و منسبت وغیرہ کے عناوین یہ ہیں۔ ضرب ہو (توحید باری عز اسمہ)، اذکار توحید ذات، اسماء و صفات و بعض عقائد اسلامیہ، مطلع نوری، مہبط انوار، جلوہ جمال یار، عشق کی تلوار، منظور ثنا، جنت کی فضا، فرط غم، مرقد نوری میں چراغاں، سرور خوباں، خورشید درخشاں، ماہِ عرب، ماہِ عجم، نقش قدم، در منسبت حضور پر نور سیدنا علاء الملت و الدین علی احمد صابر، سلام، رفعت والے عظمت والے، قاسم نعمت، سرور عالی مقام، غوثِ اعظم (منسبت)، کتلا میرے دل کی کلی غوثِ اعظم، تیرا حل ہے تیرا حرم غوثِ اعظم، دوسرا ملتا نہیں، موسم بہار، جلوے، داستانِ غم، شرابِ طہور، مدینے کے خار، نظارہ کروں میں، شاہ والا، بہار جانفزا، پیار سے گیسو، شانِ خدا تم ہو، شمع رسالت، سید ابرار، داغِ دل، اور پتھر میں نقشے جما کر چلے، مریضِ عشق، نگاہِ کرم، شوق دیدار،۔

مولانا مصطفیٰ رضا خاں کی شاعری اردو شاعری کی تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے اسی لیے انہیں ایک باکمال شاعر کہنا بے جا نہ ہو گا ڈاکٹر اختر بستوی نے لکھا ہے۔

”مفتی اعظم (مولانا مصطفیٰ رضا خان) ایک باکمال شاعر بھی تھے

اور وہ بلاشبہ ان شعراء میں شامل تھے جن کے لیے قرآن کا ارشاد ہے "الا الذین آمنوا و عملوا الصلحت و ذکر و اللہ کثیرا و انتصرو من بعد ما ظلموا" شاعری ایک سحر ہے جو مفتی اعظم ہند جیسے شاعروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر سحر حلال بن جاتی ہے۔" ۵۸

محترم نوری درحقیقت ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت، لطافت و دل کشی، سلاست و روانی، نازک خیالی و معنی آفرینی، ندرت تراکیب و استعارات و محاورات کا بر محل استعمال، شوکت الفاظ، سوز و گداز، حقیقت بیانی اور لطیف جذبات و احساسات کی فراوانی و جملہ فنی و شعری خوبیاں پائی جاتی ہیں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں شرعی ستم نظر نہیں آتا جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

گل ہاے ثنا سے مہکتے ہوئے یار
ستم شرعی سے ہیں منزہ اشعار

نعت گوئی میں فنی محاسن سے زیادہ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر شعر شریعت کی حدود میں رہ کر کہا گیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اشعار شعری و ادبی اوصاف و محاسن کا مرقع ہو تو یہ شاعر کی قادر الکلامی کا واضح ثبوت ہوتا ہے اس نقطہ نگاہ سے جب ہم ان کے مجموعہ کلام نیز ان کے اشعار کی تراکیب، زبان و بیان، صنایع و بدائع ردیف و قوافی اور بحروں کا انتخاب "سامان بخشش" کا مطالعہ کرتے ہیں تو جناب نوری اپنے دور کے نعت گو شعراء میں ایک ممتاز مقام پر فائز نظر آتے ہیں، بجا طور پر ان کی قادر الکلامی اور ان کے ماہر زبان و فن ہونے کا بھرپور ثبوت فراہم کرتے ہیں

اس قبیل کا صرف ایک شعر بطور نمونہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ اس ایک شعر میں صرف لفظ ”سرور“ چار مرتبہ استعمال کیا گیا ہے لیکن حسن بیان نے لفظ کی تکرار کے باوجود شعر کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آنے دی جب کہ عام طور پر ایک ہی معنی میں کسی لفظ کی تکرار شعر کے حق میں نقص و عیب خیال کیا جاتا ہے وہ شعر ملاحظہ ہو ۷

سرور ہے وہی سرور اے سرور ہر سرور
ہے آپ کے قدموں پہ سر جسکو فدا کرنا

دنیا کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح بیان کرتی ہیں اسی کو شعر کے قالب میں ڈھال کر نوری صاحب کہتے ہیں ۷

سارے عالم کو ہے تیری ہی جستجو

جن و انس و ملک کو تری آرزو

یاد میں تیری ہر ایک ہے سو بو

بن میں وحشی لگاتے ہیں ضرباتِ شو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

نغمہ سناں گلشن میں چرچا ترا

پہچھے ذکر حق کے ہیں صبح و مس

اپنی اپنی چہک اپنی اپنی صدا

سب کا مطلب ہے واحد کہ واحد ہے تو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

حضرت نوری نے صوفیانہ شاعری بھی کی ہے۔ صوفیوں کے نزدیک خدا کے

علاوہ کوئی موجود نہیں اور دنیا میں ہر جگہ اسی خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسے انہوں نے اردو کے ساتھ عربی جملے ملا کر اس طرح کہا ہے کہ ۷

لا	موجود	الا	اللہ
لا	مشہود	الا	اللہ
لا	مقصود	الا	اللہ
لا	معبود	الا	اللہ

لا الہ الا اللہ آمنا بر سول اللہ

ہے	موجود	حقیقی	ہے
ہے	مشہود	حقیقی	ہے
ہے	مقصود	حقیقی	ہے
معبود	حق	حقیقی	ہے

لا الہ الا اللہ امنا رسول اللہ

محبوب کے بارے میں شاعروں کے یہاں یہ تصور عام عام طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ فتنہ انگیز اور وفانا آشنا ہوتے ہیں اس کی رفتار میں ایک قیامت پوشیدہ ہوتی ہے وہ جدھر کا رخ کرتا ہے سوتے ہوئے فتنے جاگ اٹھتے ہیں گویا غزل گو شاعروں کی زبان میں محبوب کے حسن و جمال کی کوئی جامع و مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ محبوب جس سمت بھی اپنے پائے ناز اٹھادے فتنہ بھی سر اٹھادے لیکن جب مصطفیٰ رضانوری نے اپنے محبوب کے حسن و جمال اور خوبی رفتار کی تعریف کی تو اس راز سے پردہ اٹھا کہ حسن رفتار کی صحیح تعریف کیا ہے اور دراصل حسین کہلانے کا مستحق کون

ہے آپ فرماتے ہیں ۛ

وہ حسین کیا جو فتنے اٹھا کر چلے
ہاں حسین تم ہو فتنے مٹا کر چلے
فتنے جو اٹھے مٹا ڈالے روش نے آپ کی
کیوں نہ ہو دشمن بھی قاتل خوبی رفتار کا

روئے ایمانی کی تابش کے لیے خشیت الہی اور حبِ رسول دو لازمی جزو ہیں خدائے
برتر کی وحدانیت اور رسالت کا قاتل مسلمان تو ہو سکتا ہے مگر ایمان کی معراج تو بندہ
مومن کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب اس کی نگاہ خدائے برتر کی تجلیوں کی
متلاشی ہو، وہیں اس کی زندگی کا ایک لمحہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم کے ذکر اور یاد کا امین ہو صاحب حال شاعر کی یہ کیفیت اس کے قال میں ملا
خطہ ہو ۛ

ترا ذکر لب پر، خدا دل کے اندر
یونہی زندگانی گزارا کروں میں

اور پھر یہ تمنا بھی ملاحظہ فرمائیں ۛ

دم واپسی تک ترے گیت گاؤں
محمد محمد پکارا کروں میں

اور پھر منزلِ قبر کی دشواریوں کا حل دیکھیں ۛ

مرا دین و ایماں، فرشتے جو پوچھیں
تمہاری ہی جانب اشارہ کروں میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، ان کے اخلاق حسنة اور رحمتہ للعالمین کا تو خود قرآن داعی ہے، ان کی عظمت کے معترف تمام انبیاء رہے کتنے نبیوں نے تو ان کی امت میں پیدا ہونے کی تمنا کی تھی وہ حضرت آدم علیہ السلام ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر ایک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی اور ان کی افضلیت کو تسلیم کیا اور خود خدائے تعالیٰ انہیں وجہ تخلیق کون و مکاں، بناتے زمین و آسماں اور زینت ہر دو جہاں بتاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان عظمتوں کا ذکر شاعر کی زبانی سنئے ۔

تو ہے رحمت، بابِ رحمت تیرا دروان ہوا
سایہ فضلِ خدا، سایہ تری دیوار کا
جلوہ گاہِ خاص کا عالم بتاتے کوئی کیا
مہر عالم تاب ہے ذرہ حریم ناز کا
تمہارے جلوہ رنگیں ہی کی ساری بہاریں ہیں
بہاروں سے عیاں تم ہو، بہاروں میں نہاں تم ہو
کوچتہ پر نور کا ہر ذرہ رشک مہر ہے
واہ کیا کہنا ترا، مہرِ عجم ماہِ عرب
تیرے باغِ حسن کی رونق کا عالم کیا کہوں
آفتاب اک زرد پتہ ہے ترے گلزار کا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال جس طرح تمام انبیاء کرام میں مسفرد و مثالی ہے اسی طرح خدائے وحدہ لا شریک نے انہیں امتیازی صفات سے بھی سرفراز

فرمایا ہے مولانا مصطفیٰ رضانوری نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے درمیان ایک امتیازی فرق کی جانب انتہائی خوبصورت اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ دوسرے تمام انبیاء کرام کو خدائے تعالیٰ نے صفات حق سے نوازا ہے مگر رسول اللہ کی ذات گرائی ذات حق کی مظہر ہے وہ فرماتے ہیں ۷

ہیں صفات حق کے نوری، آئینے سارے نبی
ذات حق کا آئینہ مہر عجم ماہ عرب
وہ فضائل تمہیں بخشے ہیں خدا نے جن کا
آپ کے غیر میں امکان بھی آنے نہ دیا

انبیائے کرام کا ظہور، زمانے کو راہِ راست پر لانے کے لیے قدرت کی طرف سے ہوتا رہا اور انہیں وہ قوتیں بھی ملتی رہیں، جو مافوق الفطرت تھیں، جنہیں معجزہ کہا جاتا ہے اور جن کی بدولت وہ زمانے کی نظروں میں برگزیدہ اور برتر ہو سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ بیضا "حضرت عیسیٰ علیہ السلام" کا دم عیسیٰ " (دو دون کا احیاء) کی عیسیٰ نفسی اور دیگر انبیاء کے کمالات سب پر ظاہر ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سردار انبیاء تھے اس لیے ان کے معجزات بھی بے شمار اور وہ تمام کمالات جوہر نبی و رسول کو علیحدہ علیحدہ عطا کئے گئے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں جمع فرمادیے گئے۔ ہیں۔ چاند کا اشارے سے شق ہونا، ڈوبے ہوئے سورج کا لوٹنا، ابو۔ ہبل کی مٹھیوں میں کنکریوں کی شہادت وغیرہ۔ ان کمالات و معجزات کو اکثر نعت گو شاعروں نے نعت کا موضوع بنایا ہے مولانا نوری کے یہاں بھی اس کے چند نمونے دیکھتے جا

تمہارے حکم کا باندھا ہوا سورج، پھرے الٹا
جو تم چاہو کہ شب دن ہو، ابی سرکار ہو جاے

اشارہ پائے تو ڈوبا ہوا سورج برآمد ہو
اٹھے انگلی تو مرہ دو بلکہ دو، دو، چار ہو جاے
تمہارے فیض سے لائچی، مثال شمع روشن ہو
جو تم لکڑی کو چاہو تیز تر تلوار ہو جاے
شہرہ لب عیسیٰ کا جس بات میں ہے مولیٰ
تم جان میسا ہو، ٹھوکر میں ادا کرنا
نہ سایہ روح کا ہرگز، نہ سایہ نور کا ہرگز
تو سایہ کیسا اس جان جہاں کے جسم اطہر کا

محبت رسول ہی تمام افعال و اعمال اور ایمان کی جان ہے اور اگر کسی کا دل اس
سے خالی ہے تو وہ صحیح معنوں میں مومن کامل ہی نہیں۔ نوری اس مفہوم کو اس طرح
ادا کرتے ہیں ۷

جان ایماں ہے محبت تری جان جاناں
جس کے دل میں یہ نہیں خاک مسلمان ہوگا

مصطفیٰ رضا نوری کی نعتیہ شاعری میں ان کی ایک نعت "شمع رسالت" عشقِ
رسول کی بین ثبوت ہے یہ ان کے ماتنے والوں میں کافی مقبول اور مجالس و محافل میں
اکثر پڑھی جانے والی نعت رسول ہے اس نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو نزاکتِ
شعری سے بھرپور ہیں ۷

تو شمع رسالت ہے عالم ترا پروانہ
تو ماہ نبوت ہے اسے جلوہ جانا نہ

جو ساقی کوثر کے پہرے سے نقاب اٹھے
 ہر دل بنے میخانہ ہر آنکھ ہو پیمانہ
 میں شاہ نشیں ٹوٹے ہوئے دل کو نہ کہوں کیسے
 ہے ٹوٹا ہوا دل ہی مولیٰ ترا کا شانہ
 کیوں زلف معنبر سے کوچے نہ مہک اٹھیں
 ہے پہنچتہ قدرت جب زلفوں کا تری شانہ
 اس در کی حضوری ہی عصیاں کی دوا ٹھہری
 ہے زہر معاصی کا طیبہ ہی شفا خانہ
 ہر پھول میں بو تیری ہر شمع میں ضو تیری
 بلبل ہے ترا بلبل پروانہ ہے پروانہ

مولانا مصطفیٰ رضا نوری کی اکثر نعتیہ غزلوں کی زمینیں سادہ اور سہل ہیں مگر کچھ
 مشکل ردیفوں میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ ردیفوں کی سختی کی وجہ سے شعر کی زمین سخت ہو
 کر رہ گئی ہے مثلاً گیسو والی ردیف اس کے علاوہ ”مہر عجم ماہ عرب“، ”آنکھوں
 میں“، ”قلم کی صورت“ وغیرہ مگر ان زمیوں میں بھی مولانا نوری صاحب کا قلم اپنے
 مزاج کے اشعار نکال لیتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حق کے پیارے، نور کی آنکھوں کے تارے ہو تمہیں
 نور چشمِ انبیاء، مہرِ عجم، ماہِ عرب
 کب ہوتے یہ شام و سحر، کب ہوتے یہ شمس و قمر
 جلوہ نہ ہوتا گر ترا، مہرِ عجم، ماہِ عرب

آبلے پاؤں میں پڑ جائیں جو چلتے چلتے
 راہ طیبہ میں چلوں، سر سے قدم کی صورت
 کٹلے ہیں دیدہ عشاق قبر میں یونہی
 ہے انتظار کسی کا ضرور آنکھوں میں
 یہ دل تڑپ کے کہیں آنکھوں میں نہ آجائے
 کہ پھر رہا ہے، کسی کا مزار آنکھوں میں
 ماہِ تاباں پہ ہیں رحمت کی گھٹائیں چھائیں
 روتے پر نور پہ یا چھائے تمہارے گیسو

نوری صاحب کے بعض اشعار میں زبان اور انداز بیان اسقدر سادہ ہے کہ نثر کا
 گمان ہوتا ہے لیکن اہل فن جانتے ہیں اسطرح شعر گوئی ایک مشکل ترین عمل ہے مثلاً

خزانے تم کو دے کے، تم کو حق نے
 نہ قاسم ہی کہ مالک کر دیا ہے
 یہیں سے پاتے ہیں سب اپنے مطلب
 ہر اک کے واسطے یہ در کھلا ہے
 میں در در کیوں پھروں، در در سنوں کیوں
 مرے سرور مرا کیا سر پھرا ہے
 رہے پیش نظر وہ روتے انور
 ترستی آنکھوں کی یہ التجا ہے

مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی ۱۴ محرم الحرام ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو اس دنیا سے فانی سے انتقال کر گئے اس وقت ہندو پاک کے تمام اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات نے ان کی تعریفات کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا تھا ان میں سے ہم تین زبانوں (اردو، ہندی، انگریزی) کے بعض اخبارات کے تاثرات کو پیش کرتے ہیں جو یہ ہیں۔

انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا (دہلی) لکھتا ہے، ”مولانا مصطفیٰ رضا خان کا انتقال، موصوف کی شخصیت تمام فرقوں کے نزدیک یکساں مقبول تھی۔“ (انگریزی سے ترجمہ) ہفت روزہ نئی دنیا دہلی رقمطرز ہے، ”دنیا سے اسلام کی ایک مایہ ناز اور جید دینی و علمی شخصیت ہم سے بچر گئی۔“ روزنامہ امر اجالا ہندی (بریلی) اپنا تاثر یوں پیش کرتا ہے، ”بریلی شریف کے نام سے انہیں سبھی ورگوں سے لوگ سمان دیتے تھے، دیش بہ دیش میں ان کے ایک کڑور سے ادھک انویائی ہیں۔“ ۵۹

ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ لوگ شریک تھے جو ہندو بیرون ہند کے تھے۔ عالمی حکومتوں کے نمائندے اور سفراء بھی شریک جنازہ تھے۔ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کا تعزیتی پیغام لے کر سفیر پاکستان حاضر ہوئے اور ہندوستان کے سابق صدر فخر الدین علی احمد کی اہلیہ اہل خانہ کی تعزیت کے لیے حاضر ہوئیں جس سے ان کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے کتنی ہمہ گیر اور مایہ ناز شخصیت تھے۔

حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، کان پور، ۱۳۹۱ء ص ۴۲، ۴۳
- ۲۔ کلام رضا، اصغر حسین خان، دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۰، ۱۱
- ۳۔ فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں، مسعود احمد، الہ آباد فروری ۱۹۸۱ء ص ۶۳
- ۴۔ الاجازت المتینہ، حامد رضا خان (قلمی) ص ۳۶
- ۵۔ دیدہ سکندری، رام پور، ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء ص ۵
- ۶۔ امام احمد رضا خان، ایک ہمہ جہت شخصیت، مولانا کوثر نیازی، کراچی جنوری ۱۹۹۱ء ص ۱۷
- ۷۔ Neglected Genius of the East by Prof
Muhammad Masud Ahmed, Karachi Page 11
- ۸۔ Imam Ahmed Raza has left A Rich Treasure
of knowledge by, Karachi Page 18
- ۹۔ ضمیمہ المعتقد المنتقد، انجاز ولی خان، لاہور، ص ۶۶
- ۱۰۔ کنز الایمان اہل حدیث کی نظر میں، ناشر رضا اکادمی بمبئی ص ۵، ۶
- ۱۱۔ حصہ تقریفات الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ، مولانا احمد رضا خان، کراچی ص ۷۰، ۷۱
- ۱۲۔ نزہۃ الخواطر و ہیجۃ المسامح والنواظر، الجزیر الشامن، ابوالحسن ندوی، حیدرآباد ۱۹۷۰ء ص ۴۱
- ۱۳۔ چودھویں صدی کے مجدد اعظم، مولانا خضر الدین بہاری مشمولہ مضمون حیات مبارکہ از پروفیسر
مسعود احمد، ص ۲۱
- ۱۴۔ امام اہل سنت! ڈاکٹر مسعود احمد، الہ آباد ۱۹۸۱ء ص ۴۲
- ۱۵۔ تاریخ نعت گوئی میں حضرت رضا بریلوی کا منصب، شاعر لکھنوی، لاہور، ص ۲۲، ۲۵
- ۱۶۔ امام احمد رضا خان ایک ہمہ جہت شخصیت، کوثر نیازی، ص ۲۳، ۲۴

- ۱۷۔ اردو میں صوفیانہ شاعری، ڈاکٹر محمد طیب ابدالی، الہ آباد مئی ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۳
- ۱۸۔ عرفان، رضا، ڈاکٹر اہلی بخش، الہ آباد ۱۹۸۲ء، ص ۷۴
- ۱۹۔ محمود احمد قادری نے تذکرہ علمائے اہل سنت مطبوعہ کانپور ۱۳۹۱ھ ص ۷۸ میں یہ لکھا ہے کہ
حسن ۴ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے جو ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی تحریر کے مطابق
درست نہیں ہے انہوں نے "چند شعراء بریلی" میں ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر
۱۸۵۹ء سنہ پیدائش و تاریخ لکھا ہے جو میرے نزدیک درست ہے کیوں کہ ادیب صاحب حسن
کو بہت قریب سے جانتے ہیں وہ خود بریلی کے رہنے والے ہیں۔
- ۲۰۔ اداریہ، اردو کے معلمی، علی گڑھ، حسرت موہانی، جون ۱۹۱۲ء
- ۲۱۔ تفسیر ابر کرم، مولوی امیر الدین، دہلی ۱۳۰۷ھ، ص ۸۹
- ۲۲۔ مکتوب شیخ شمس الدین میرٹھی بنام ڈاکٹر ایوب قادری مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۹ء
- ۲۳۔ انوار ساطعہ، عبد السمیع بیدل، مطبع نعیمی مراد آباد ص ۲
- ۲۴۔ اردو کے معلمی، شمارہ اول، جلد اول (غائب نمبر)، دلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۱
- ۲۵۔ تلامذہ: مالک رام، نئی دلی ۱۹۸۴ء، ص ۸۷
- ۲۶۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور (یو۔ پی) کی بنیاد آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال سے زائد پہلے بادشاہ
شاہ جہاں کے زمانہ میں حضرت محمد رشید صاحب (دیوان جی) کے ہاتھوں پڑی (تجلیات آسی، ڈی،
این خزویدی ص ۴۸)
- ۲۷۔ عین المعارف، نقد و نظر: مجنوں گورکھ پوری، مطبوعہ پاکستان، کراچی اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۳۸
- ۲۸۔ عین المعارف، مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۷۵، ۷۶ (ملحق مضمون از شاہد علی عیسیٰ)
- ۲۹۔ قومی ڈائجسٹ، لاہور اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۱
- ۳۰۔ تجلیات آسی: ڈی این چترویدی ص ۶۰
- ۳۱۔ نوائے وقت، لاہور ۲۴ اپریل ۱۹۷۵ء

۳۲۔ نقوش لاہور نمبر ص ۹۴۹

- نوٹ:- سید محمد مرتاج حسین رضوی، روہیل کسٹڈیونیورسٹی، بریلی سے مولانا تفسی احمد خاں میکیش
پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت ہی نفسی تحقیقی مقالہ قلم بند ہے جو
یونیورسٹی میں ۱۹۹۷ء میں داخل کر دیا ہے۔ یہ قابل مطالعہ ہے۔ ناشر
- ۳۳۔ المیزان (ماہنامہ) بمبئی ۷ اپریل ۱۹۴۶ء۔
- ۳۴۔ المیزان، بمبئی اپریل ۱۹۴۶ء۔
- ۳۵۔ ماہنامہ حجاز جدید، دہلی، سنوری ۱۹۹۰ء ص ۵۰۔
- ۳۶۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، مطبوعہ کان پور ۱۳۹۱ھ ص ۵۳۔
- ۳۷۔ شذرات، سید سلیمان ندوی، معارف انٹرنیشنل بون ۱۹۴۹ء ص ۴۰۲۔
- ۳۸۔ تذکرہ علمائے اہل سنت: محمود احمد قادری، کان پور ۱۳۹۱ھ ص ۱۰۱۔
- ۳۹۔ گنجائے گرانمایہ، رشید احمد سدیقی، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی ۱۹۵۱ء ص ۵۵۔
- ۴۰۔ فکر و نظر، ناموران علی گڑھ تیسرا کاروان (جلد دوم) خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء ص ۵۱۔
- ۴۱۔ کاروان حیات، مشتاق احمد خاں، لاہور ۱۹۷۴ء ص ۸۸۔
- ۴۲۔ نیا دور، ابوالکلام آزاد نمبر ص ۴۵-۴۶ مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد کا تحریک خلافت
میں حصہ" از محمد رضا
- ۴۳۔ انور، سلیمان اشرف ص ۲۰۱۔
- ۴۴۔ فکر و نظر، ناموران علی گڑھ تیسرا کاروان، جلد دوم، مارچ ۱۹۹۱ء ص ۴۶۔
- ۴۵۔ انور، سلیمان اشرف ص ۲۳۱۔
- ۴۶۔ انور، سلیمان اشرف مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء ص ۱۴۷-۱۴۹۔
- ۴۷۔ انور، سلیمان اشرف ص ۲۰۲۔
- ۴۸۔ تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری، ص ۱۰۰۔
- ۴۹۔ الحج، سلیمان اشرف، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۸ء۔

- ۵۰ - تذکرہ علمائے اہل سنت، محمود احمد قادری ص ۱۰۰
- ۵۱ - گنجھانے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، فرینڈز پبلشرز راولپنڈی ۱۹۵۱ء، ص ۲۵-۲۶
- ۵۲ - ماہنامہ، اعلیٰ حضرت، بریلی، جولائی ۱۹۶۵ء، ص ۱۰
- ۵۳ - ماہنامہ مجاز جدید، دلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص ۷۷
- ۵۴ - ماہنامہ استقامت (کانپور ماہ مئی ۱۹۸۳ء)، ص ۱۵۲
- ۵۵ - ماہنامہ مجاز جدید، دلی ستمبر اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص ۸۰
- ۵۶ - الموت الاحمر، مصطفیٰ رضا، مکتبۃ الحیب الہ آباد ص ۲۱۰
- ۵۷ - مقدمہ الاستعداد، ص ۳۲
- ۵۸ - ماہنامہ استقامت کانپور، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۳۹۸
- ۵۹ - یہ سارے اخباری تاثرات ماہنامہ استقامت (ڈائجسٹ)، کانپور ماہ مئی ۱۹۸۳ء کے حوالے سے درج ہیں۔

<http://t.me/Tehqiqat>

مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی

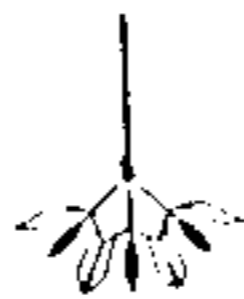
کنز الایمان

ارد

معروف تراجم قرآن

ڈاکٹر مجید اللہ قادری

(ایم۔ ایس۔ سی، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)



ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان
کراچی ————— اسلام آباد

مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی

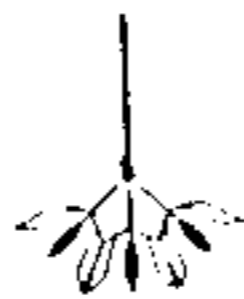
کنز الایمان

ارد

معروف تراجم قرآن

ڈاکٹر مجید اللہ قادری

(ایم۔ ایس۔ سی، ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی)



ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان
کراچی ————— اسلام آباد